تعلیم و تربیت

مارچ 1995ء

Sharjeel Ahmed
شرجیل

Sharjeel Ahmad
Date
No.

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

السّلامُ علیکُم

تعلیم و تربیت کے تمام ساتھیوں کو بہُت بہُت عید مُبارک! اللہ کرے یہ عید آپ کے لیے اِتنی ساری خوشیاں لائے کہ آپ سے سنبھالی نہ جائیں۔

عید کے دن، فجر کی نماز کے بعد، سوئیں نہیں۔ جلدی سے نہا دھو کر، صاف سُتھرے کپڑے پہن کر تیاّر ہو جائیں۔ نماز کے لیے جانے سے پہلے کوئی میٹھی چیز کھائیں، اور ابُّو سے پُوچھ لیں کہ اُنھوں نے صدقۂ فطر ادا کر دیا ہے؟ صدقۂ فطر عید کی نماز سے پہلے دینا اچھّا ہے۔ ویسے نماز کے بعد بھی دیا جا سکتا ہے۔

عید کی نماز، اپنے ابُّو اور رشتے داروں کے ساتھ، عید گاہ یا جامع مسجد میں جا کر پڑھیے۔ بڑی اور کھُلی جگہ نماز پڑھنے کا زیادہ ثواب ہے۔ نماز کے بعد خُطبہ سُنیے اور جب اِمام صاحب دُعا مانگیں تو اُن کے ہر جُملے کے بعد آمین کہیے۔ دُعا کے بعد رشتے داروں اور دوستوں سے گلے ملیے۔ گھر آ کر آپ کے ابُّو، امّی اور رشتے دار جتنی عیدی دیں اُسے، شکریے کے ساتھ، ہنسی خوشی قبول کر لیجیے۔ زیادہ کے لیے ضد نہ کیجیے۔

اور اب ایک دُکھ بھری خبر۔ آپ کو یہ جان کر بہُت افسوس ہو گا کہ آپ کے لیے پیاری پیاری، مزے دار نظمیں لکھنے والے بُزرگ شاعر، جناب فیض لودھیانوی، گُزشتہ جنوری کی 6 تاریخ کو اللہ کو پیارے ہو گئے۔ دُعا کیجیے کہ خداوند تعالیٰ مرحوم کو جنّت میں اُونچا درجہ عطا فرمائے۔ آمین!

اس شمارے میں

عنوان	مصنف	صفحہ
اداریہ		1
عید مبارک (نظم)	قتیل شفائی	2
بادشاہ کی خالہ (کہانی)	سعید لخت	3
ایک عام سا بلو نگڑا (کہانی)	سلیم احمد صدیقی	6
تیاّ پہلوان (کہانی)	نظر زیدی	10
23 مارچ (نظم)	حفیظ الرحمٰن احسن	14
بند دروازہ (کہانی)	محمد یونس حسرت	15
بھلی بات (درسِ قرآن)	ڈاکٹر عبد الرؤف	21
آدم خور شیر (سُنہری چڑیا)	ڈاکٹر نصیر احمد ناصر	22
عید الفطر (مضمون)		24
خطرناک منصوبہ (کہانی)	سلیم خان گمی	25
کیا، کیوں، کیسے (معلومات)	س۔ل	31
انسانیت کے نام پر (کہانی)	اشتیاق احمد	33
قائدِ اعظم (نظم)	محمد عارف قریشی	38
مرغ پھولے (کہانی)	رفعت شاہین	39
آئیے مسکرائیں (لطائف)		42
آپ جانتے ہیں؟		43
باتیں بڑوں کی		44
دماغ لڑاؤ / علمی آزمائش		46
آپ کا خط ملا		47
آپ بھی لکھیے		50
آئیے دوست بنائیں		54
تتلیاں (نظم)	فرحت شاہجہانپوری	57
چچا بھلکڑ گئے سسرال (کہانی)	ذکیہ بلگرامی	58
مجرم کون؟		64

5 واں سال
بارہواں شمارہ
تعلیم و تربیت
...میں سب سے زیادہ پڑھا جانے والا
...کا محبوب رسالہ
...ٹر عبد السلام
سعید لخت
...ایڈیٹرز: رِضوان ثاقب
...رزائنگ سید شوکت الجاز
...سٹنٹ محمد بشیر راہی
...فیروز سنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ لاہور
ظہیر سلام
عبد السلام
پتا
...مہ تعلیم و تربیت
...شارع بن بادیس لاہور
6361309-6361310
6278815-6278816
...سرکولیشن اور اکاؤنٹس
...شاہراہ قائدِ اعظم لاہور
سالانہ قیمت
...صرف رجسٹری کے ساتھ -/250 روپے
...طریقہ (ہوائی ڈاک سے) - 475 روپے
...ڈاک سے) -/675 روپے
...بعید (ہوائی ڈاک سے) -/695 روپے
...ڈرافٹ کے ذریعے پیشگی ارسال کیجیے
...چ 1995
...قیمت فی پرچہ -/12 روپے
...سرورق: چچا بھلکڑ گئے سسرال

عید مُبارک، پیارے بچّو، عید مُبارک
اے اِس دیس کے سارے بچّو، عید مُبارک
مِلی ہیں تم کو عید کی خوشیاں
اِک دُوجے کی دِید[1] کی خوشیاں
گلے ملے ہو تُم پیاروں سے
اپنے دوستوں اور یاروں سے
چمکے بھاگ[2] تمھارے بچّو، عید مُبارک
اے اِس دیس کے پیارے بچّو، عید مُبارک
مِیٹھی عید کا دِن جب آئے
خوب سِوَیّاں ہمیں کھلائے
ابُّو، امّی، بھائی، بہنیں
اچھّے اچھّے کپڑے پہنیں
سب ماریں لشکارے، بچّو، عید مُبارک
اے اِس دیس کے پیارے بچّو، عید مُبارک

(1) دیکھنا (2) قسمت۔ نصیب

جب سوہنی کی بیٹی لاڈو ذرا بڑی ہوئی تو سوہنی نے اُس سے کہا "بیٹی، اب تم، خیر سے، سیانی ہوگئی ہو۔ اپنے کھانے پینے اور رہنے سہنے کا اِنتظام خود کر سکتی ہو۔ اب تم کہیں اور جا کر اپنا گھر بساؤ۔ ہم جانوروں کا یہی دستور ہے۔ جب ہماری اولاد بڑی ہو جاتی ہے تو ماں باپ کا گھر چھوڑ دیتی ہے"۔

لاڈو کی آنکھیں خوشی سے پھیل گئیں۔ چہک کر بولی "امّی، آپ ٹھیک کہتی ہیں۔ اب میں اپنی دیکھ بھال خود کر سکتی ہوں"۔

"تو پھر جاؤ، میری بنّو۔ لیکن جانے سے پہلے میری ایک بات پلّے باندھ لو" سوہنی نے کہا "تم غریبوں کی بستی میں پیدا ہوئی تھیں اور یہیں پلی بڑھی ہو۔ لیکن یہ کبھی مت بھولنا کہ تم بادشاہ سلامت کی خالہ ہو۔ جہاں رہنا، رُعب سے رہنا۔ کسی سے مت ڈرنا۔ جو چاہے لے لینا۔ کسی سے مت پوچھنا"۔

"میں آپ کی یہ بات ہمیشہ یاد رکھوں گی، امّی" یہ کہہ کر لاڈو نے فخر سے سر اُونچا کیا، گچھّے دار دُم کھڑی کی اور ٹھمک ٹھمک چل دی۔

چلتی گئی، چلتی گئی، یہاں تک کہ دوپہر ہوگئی۔ بھوک لگنے لگی۔ رُک کر اِدھر اُدھر دیکھا کہ کوئی چوہا یا چڑیا آس پاس ہو تو اُسے دبوچ لے۔ چوہا یا چڑیا تو نظر نہیں پڑی، ایک اِیرانی بلّی دکھائی دی جو ایک طرف بیٹھی مزے سے مچھلی کھا رہی تھی۔

لاڈو نے زور سے خُررر فِش کی اور اِیرانی بلّی سے بولی "یہ مچھلی مجھے دو۔ میں کھاؤں گی"۔

اِیرانی بلّی غصّے سے پُھنکار کر بولی "کیوں؟ تم کیوں کھاؤ گی؟ تم میں کیا سُرخاب کے پَر لگے ہیں؟"

"میں بادشاہ سلامت کی خالہ ہوں۔ جو چاہے لے سکتی ہوں" لاڈو نے اکڑ کر کہا اور مچھلی اُس سے چھین لی۔

دونوں گتھّم گتھّا ہوگئیں۔ لگیں ایک دوسرے کے بال نوچنے، کھرونچے مارنے۔ لڑتے لڑتے تھک گئیں تو بیٹھ کر ہانپنے لگیں۔ کچھ دیر بعد اِیرانی بلّی بولی "تم چور ہو، ڈاکو ہو۔ کسی گندی بستی کی لگتی ہو۔ تم بادشاہ سلامت کی خالہ کیسے

ہو سکتی ہو؟ اُن کی خالہ تو میں ہوں"۔

"تم سوتیلی خالہ ہوگی" لاڈو نے پھنکار کر کہا "میں سگی خالہ ہوں"۔

دونوں دیر تک اِس بات پر جھگڑتی رہیں۔ آخر فیصلہ یہ ہُوا کہ وہ بادشاہ سلامت کے پاس جائیں اور اُن سے پُوچھیں کہ اُن کی خالہ کون ہے۔

سامنے ایک مکان تھا، بڑا سا، خوب صورت سا۔ اُس کا دروازہ کُھلا ہُوا تھا۔ اُنہوں نے سوچا، اِس گھر میں جاکر تھوڑا آرام کرلیں۔ پھر آگے چلیں گے۔ اندر گئیں تو کیا دیکھتی ہیں، ایک کمرے میں ایک خوب صورت سے گدّے پر، ایک پیاری سی، مَن موہنی سی بلّی لیٹی سو رہی ہے۔ یہ مِصری بلّی تھی۔

لاڈو نے زور سے خُرر فِش کی، پھر مِصری بلّی کے پنجہ مار کر بولی "چلو، بھاگو یہاں سے۔ اِس گدّے پر مَیں لیٹوں گی"۔

مصری بلّی غصّے سے تن فن ہوگئی۔ آنکھیں نکال کر بولی "تم کون ہو، اور تمہیں میرے آرام میں خلل ڈالنے اور بدتمیزی سے بولنے کی جُرأت کیسے ہوئی؟"

"میں بادشاہ سلامت کی خالہ ہوں" لاڈو بڑے غرور سے سر اُونچا کر کے بولی "میں جو چاہوں، کر سکتی ہوں اور جس طرح چاہوں، بول سکتی ہوں"۔

مِصری بلّی بولی "میں کہتی ہوں، چُپ چاپ یہاں سے چلی جاؤ۔ بادشاہ سلامت کی خالہ میں ہوں۔ تم جیسی مری مُردار، خُدائی خوار، گندی بستی میں رہنے والی شیر کی خالہ نہیں ہو سکتی"۔

لاڈو نے کہا "خوب! بہت خوب! تو تم بھی اپنے آپ کو بادشاہ سلامت کی خالہ سمجھتی ہو۔ اُٹھو، ہمارے ساتھ چلو۔ ہم بادشاہ سلامت کے پاس جا رہے ہیں۔ وُہی بتائیں گے کہ اُن کی خالہ کون ہے"۔

"چلو" مصری بلّی بولی "لیکن میں مِصر کی شہزادی ہوں۔ میں آگے آگے چلوں گی اور تم میرے پیچھے پیچھے"۔

وہ تھوڑی دُور ہی گئی تھیں کہ اُنہیں برما کی ایک بلّی ملی۔ اُس نے پوچھا "اے بہن، کہاں جا رہی ہو؟ بہت غصّے میں ہو۔ بات کیا ہے؟"

"بات یہ ہے" لاڈو بولی "ہم میں سے ہر ایک یہ سمجھتی ہے کہ وہی بادشاہ سلامت کی خالہ ہے"۔

"تو پھر؟" برمی بلّی نے پوچھا۔

"تو پھر یہ کہ ہم بادشاہ سلامت کے پاس جا رہے ہیں۔ وُہی اِس جھگڑے کا فیصلہ کریں گے" اِیرانی بلّی نے جواب دیا۔

"تم میں سے کوئی بھی بادشاہ سلامت کی خالہ نہیں" برمی بلّی بولی "اللہ بخشے، میری امّی نے مجھے بتایا تھا کہ بادشاہ سلامت کی خالہ میں ہوں"۔

"اچّھا" لاڈو نے کہا "یہ بات ہے تو تم بھی ہمارے ساتھ چلو"۔

برمی بلّی بھی اُن کے ساتھ ہولی۔ وہ سارا دن چلتی رہیں، چلتی رہیں اور اُنہیں ایک کے بعد ایک بلّی مِلتی گئی۔ شام تک بِلّیوں کی ایک لمبی سی قطار لگ گئی۔ ہر بلّی اپنے آپ کو بادشاہ کی خالہ سمجھتی تھی۔ وہ اپنے خیالوں میں اِس قدر کھوئی ہوئی تھیں کہ اُنہیں نہ تو بھوک پیاس نے ستایا اور نہ تھکن کا اِحساس ہُوا۔ وہ رات بھر چلتی رہیں اور صبح کو، پَو پھٹے، جنگل میں پہنچیں۔

جنگل کا بادشاہ، ببر شیر، اپنی کچھار میں پڑا سو رہا تھا۔ اُس نے اِتنی ساری بلّیوں کی میاؤں میاؤں سُنی تو ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھا۔

"حضُور!" لاڈو نے بڑے ادب سے کہا "ہم مُعافی چاہتے ہیں کہ ہم نے حضُور کو بے آرام کیا۔ ہم دراصل آپ کے پاس ایک مُقدّمہ لے کر حاضر ہوئے ہیں"۔

"کیسا مُقدّمہ؟" ببر شیر نے جمائی لے کر کہا۔

"عالی جاہ! یہ بلّیاں سمجھتی ہیں کہ یہ حضُور کی خالہ ہیں۔ میرے خیال میں تو یہ سب بے وقوف ہیں۔ میری امّی نے مُجھ سے کہا تھا کہ تُم بادشاہ سلامت کی خالہ ہو"۔

"حضور، ہماری ماؤں نے بھی ہم سے یہی کہا تھا" تمام بلّیاں چلّا کر بولیں۔

ببر شیر نے مسکرا کر بلّیوں کی طرف دیکھا، اور پھر قہقہہ مار کر ہنس پڑا۔ ہنستے ہنستے اُس کا پیٹ دُکھنے لگا، آنکھوں میں آنسو آگئے۔ بلّیاں حیرت سے اُس کا مُنہ تکنے لگیں کہ بادشاہ سلامت کو ایکا ایکی کیا ہوگیا؟ اِن پر ہنسی کا دورہ کیوں پڑ گیا؟

لاڈو ڈرتے ڈرتے بولی "حضور، اِس میں ہنسی کی کیا بات ہے؟ آپ کو صِرف یہ فیصلہ کرنا ہے کہ آپ کی خالہ کون ہے"۔

"اری بے وقوفو!" شیرؔ نے کہا "تم سب میری خالائیں ہو"۔

بلّیاں حیرت سے ایک دوسرے کو دیکھنے لگیں۔

شیر بولا "تم ہی نہیں، دُنیا کی تمام بلّیاں، چاہے وہ پاکستانی ہوں یا اِیرانی، مِصری ہوں یا برمی، غریبوں کی گندی بستیوں کی بلّیاں ہوں یا امیروں کی خوب صورت اور صاف سُتھری بستیوں کی بلّیاں، وہ سب فخر سے سر اُونچا کر کے چلتی ہیں، اور جو چیز چاہتی ہیں، بے جِھجک لے لیتی ہیں۔ سب اپنی مرضی کی مالِک ہیں۔ اپنی مرضی سے آتی ہیں اور اپنی مرضی سے جاتی ہیں۔ کیوں کہ اِن سب کی رگوں میں شاہی خون ہے

"اور اب اے میری خالاؤ، اپنے اپنے گھروں کو جاؤ۔ تم سب میری خالائیں ہو۔ ہم شیروں نے تم ہی سے شکار کرنے کے سارے گُر اور داؤ پیچ سیکھے ہیں۔ مگر خالہ جان، تُم نے ایک گُر ہمیں نہیں سکھایا"۔

"کون سا گُر، عالی جاہ؟" بلّیوں نے پُوچھا۔

"درخت پر چڑھنے کا گُر" شیر نے کہا۔

لاڈو بولی "میری امّی کہتی ہیں، یہ گُر ہم نے آپ کو اِس لِیے نہیں سکھایا کہ آپ ہم سے ناراض ہو جائیں اور ہمیں پکڑنے دوڑیں تو ہم درخت پر چڑھ کر اپنی جان بچا لیں"۔

"ہو ہو ہو، ہی ہی ہی، ہاہاہا!" شیر ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہوگیا "تم بہُت ہوشیار اور چالاک ہو۔ آخر کو ہماری خالہ ہو ناں"۔

(مرکزی خیال ماخوذ)

"ارے! یہ کیا ہے، بھئی؟" مریم نے اپنا بستہ باورچی خانے کی میز پر رکھتے ہوئے کہا۔ میز کے نیچے کچھ تھا، چھوٹا سا، گُل گوتھنا سا، تھن متھنا سا۔ ایک کونے میں سُکڑا سمٹا بیٹھا تھا۔

"کیسا لگا تمہیں؟" امّی نے برتن دھوتے دھوتے پلٹ کر مریم سے پوچھا۔

"ارے، ہاں" مریم نے اب پہچان لیا تھا کہ یہ کیا ہے۔ "یہ تو بلّی کا بچّہ ہے---- بلونگڑا۔ کس کا ہے؟"

"بیگم فاروقی نے سُنا تھا کہ تمہیں بلّی کا بچّہ چاہیئے، بس وہ تمہارے لیے کہیں سے لے آئیں۔ کتنا پیارا ہے!" امّی نے میز کے نیچے جھانکتے ہوئے کہا "پُچ، پُچ۔ اِدھر آؤ، بلونگڑے"

بلونگڑا تو اپنی جگہ سے ہلا تک نہیں، البتّہ مریم نے امّی سے کہا "مگر یہ تو ایک عام سا بلونگڑا ہے۔ آپ نے بیگم فاروقی آنٹی کی بلّی شہزادی دیکھی ہے؟ جب تخت پر بیٹھی ہو تو سچ مچ کی شہزادی لگتی ہے"۔

"مگر بیٹے، وہ تو برمی بلّی ہے۔ برمی بلیّاں بہُت خوب صورت ہوتی ہیں" امّی نے مریم کو سمجھایا۔

"بس، مجھے نہیں چاہیئے یہ عام سا بلونگڑا۔ لو بھلا، آنٹی لائیں بھی تو عام سا بلونگڑا" مریم نے پاؤں پٹختے ہوئے کہا "مجھے بھی برمی بلّی کا بچّہ لا دیتیں، اپنی شہزادی جیسا"۔

"بیٹے، ایسا نہیں کہتے" امّی نے سمجھایا "بیگم فاروقی کو تو وہ بلّی اُن کی بھابی نے برما سے لاکر دی ہے۔ تم یہ تو دیکھو کہ اُنہیں تمہاری خواہش یاد رہی۔ دیکھو تو سہی، کتنا پیارا بلونگڑا ہے۔ کیسی بھولی بھولی آنکھوں سے ہماری طرف دیکھ رہا ہے"۔

"کوئی بھولی بھولی نظریں نہیں ہیں" مریم نے غصّے سے کہا "یہ تو عام سا بلونگڑا ہے۔ میرا تو خیال ہے کہ میں نے اِسے کل گلی میں پھرتے ہوئے دیکھا تھا۔ کل صبح جب میں اِسکول جانے کے لیے گھر سے نکلی تو یہ ہمارے گھر کے باہر کیاری میں دبکا بیٹھا تھا"۔

"تم ٹھیک کہ رہی ہو" امّی نے کہا "بیگم فاروقی اِسے

پکڑ کر گھر لے گئی تھیں۔ انُھوں نے اِسے بڑے پیار سے نہلایا دُھلایا اور دودھ پلایا۔ پھر دوپہر کے وقت، جب تم اِسکول گئی ہوئی تھیں، اِسے یہاں چھوڑ گئیں۔ دیکھو تو، کتنا پیارا ہے!"

"کوئی پیارا وارا نہیں ہے" مریم نے کہا "اگر یہ پیارا ہے تو فاروقی آنٹی نے خود کیوں نہیں رکھ لیا اِسے؟"

"وہ شاید اِسے بھی رکھ لیتیں، مگر جب شہزادی نے اُنہیں اِسے نہلاتے دُھلاتے اور ناشتا کراتے دیکھا تو وہ اُن سے ناراض ہوکر کونے میں جا بیٹھی اور اُن کے بُلانے پر بھی اُن کے پاس نہیں آئی"۔

"اچھا!" مریم نے حیرت سے کہا "وہ تو شہزادی کہتے ہی دوڑ کر آنٹی کے پاس آجاتی ہے۔ وہ تو اُن سے بہُت پیار کرتی ہے"۔

"ہاں، تو بس دیکھ لو" امّی نے کہا "اِسی لِیے وہ اِسے تمُہیں دے گئی ہیں۔ اِس طرح اُن کی شہزادی بھی اُن سے ناراض نہ ہوگی اور تمہیں بھی دل بہلانے کے لِیے ایک بِلّی مِل جائے گی"۔

"مگر امّی، میں اِسے نہیں رکھوں گی۔ یہ تو ایک عام سا بلونگڑا ہے" مریم نے کہا "میں نہیں رکھوں گی اِسے۔ بس میں نے کہ دیا"۔

اُسی وقت دھڑام سے باورچی خانے کا دروازہ کُھلا اور مریم کا بڑا بھائی، نبیل، اندر آیا۔ وہ مریم سے دو سال ہی بڑا تھا مگر اُس پر رُعب بہُت ڈالتا تھا۔

"آج کیا پکا ہے؟" نبیل نے اپنا بھاری بھرکم بستہ میز پر پھینکتے ہوئے کہا "سخت بھوک لگ رہی ہے"۔

"آلو مٹر قیمہ" امّی نے ہانڈی میں ڈوئی چلاتے ہوئے کہا "بس پانچ مِنٹ میں تیّار ہُوا جاتا ہے"۔

لیکن نبیل تو اچانک میز کے نیچے گھُس گیا تھا۔ جب اُس نے میز پر اپنا بستہ پٹخا تھا تو بلونگڑا ڈر گیا تھا اور اُس نے سہمی ہوئی آواز میں نعرہ لگایا تھا "می اِی اِی آؤں"۔

"ارے! یہ تو بلونگڑا ہے" نبیل نے کہا "یہ تمہارا بلونگڑا ہے، مریم؟"

"نہیں۔ یہ میرا بلونگڑا وُلونگڑا نہیں ہے" مریم چلّائی۔

"یہی تو میں سوچ رہا تھا کہ یہ تو ایک عام سا بلونگڑا ہے اور تمہیں تو پسند تھی شہزادی----- وہ برمی بلّی ہے یا شاید اِیرانی بلّی" نبیل نے کہا۔ وہ ابھی تک میز کے نیچے گھُسا ہوا تھا اور بلونگڑے کا جائزہ لے رہا تھا "مگر مریم، ایک بات کہوں؟ یہ بلونگڑا بھی بڑا پیارا ہے۔ ذرا دیکھو تو سہی"۔

"نہیں، میں نہیں دیکھتی" مریم نے مُنہ بناتے ہوئے کہا "کل جُمعہ ہے۔کل اِسے فاروقی آنٹی کو واپس دے آنا"۔

"اچھا بابا، اچھا" امّی کا دِھیان ہانڈی میں پڑا تھا۔ اُنھوں نے چڑ کر جواب دیا "کر آئیں گے واپس"۔

"اِس میں غصّے کی کیا بات ہے، بھئی مریم؟" نبیل نے کہا "میرے خیال میں تو بلّی بس بلّی ہوتی ہے، چاہے برما کی ہو یا پاکستان کی۔ اور مُجھ سے پوچھو تو بلونگڑا بھی بس بلونگڑا ہی ہوتا ہے---- پُچ پُچ!" آخر کے دو لفظ اُس نے پیار سے بلونگڑے سے کہے تھے جو آہستہ آہستہ اُس کی جانب بڑھنے لگا تھا۔

"تم پُچ پُچ کرو یا کھُچ کھُچ۔ میں اِسے بالکُل نہیں رکھوں گی"۔ مریم مُنہ بنا کر بولی۔

"ارے بھائی، ٹھیک ہے" امّی نے ہانڈی چولہے پر سے اُتارتے ہوئے کہا "مت رکھنا۔ کل ہم اِسے بیگم فاروقی کو شکریے کے ساتھ واپس کر آئیں گے"۔

نبیل اب میز کے نیچے سے نکل آیا تھا۔ وہ بولا "اچھا بھئی بلونگڑے جی، ہمیں افسوس ہے کہ ہم آپ کو نہیں رکھ سکتے کیوں کہ آپ ایک سادہ سے، عام سے، پاکستانی بلونگڑے ہیں۔ سمجھ گئے ناں آپ؟"

نہ جانے بلونگڑے کی سمجھ میں کچھ آیا یا نہیں، اُس نے بڑے بھولپن سے کہا "می---اِی---اِی---اِی---آؤں!"۔

کھانے کا وقت ہوگیا تھا۔ سب آرام سے بیٹھ کر کھانا کھانے لگے۔ بات آئی گئی ہوگئی۔ امّی نے دودھ کا ایک پیالہ میز کے نیچے رکھ دیا تھا اور ہلکی ہلکی چپڑ چپڑ کی آواز نیچے سے

آ رہی تھی۔ مریم تو کسی طرح بھی بلونگڑے کو دیکھنے پر آمادہ نہ تھی، لیکن اچانک اُس کی نظر نیچے پڑی تو بلونگڑا اُس کے پاؤں کے پاس کھڑا اُس کی جانب ٹُکر ٹُکر دیکھ رہا تھا اور اُس کی مونچھوں پر دودھ کی چھینٹیں نظر آ رہی تھیں۔ وہ بڑا بھولا اور پیارا لگ رہا تھا۔ مگر مریم نے ہُونہہ کہہ کر مُنہ دوسری طرف پھیر لیا۔

اُس رات مریم سونے کے لیے بستر پر لیٹی تو اُسے کافی دیر تک نیند نہ آئی۔ وہ بلّیوں کے بارے میں سوچتی رہی۔ برمی بلّیاں، مِصری بلّیاں، اِیرانی بلّیاں، سفید بلّیاں، کالی بلّیاں، چِت کبری بلّیاں--- آں---- آں---- اور پھر نہ جانے کب اُسے نیند آ گئی۔

آدھی رات کو اچانک اُس کی آنکھ کُھل گئی۔ یہ کیا تھا؟ کون تھا؟ اُسے ایسا لگا جیسے اُس کے بستر کی چادر کو کوئی پائینتی کی طرف سے کھینچ رہا ہے۔ وہ ڈر گئی۔ آہستہ سے بولی "کون ہے؟" اور جب کوئی جواب نہ آیا تو غور سے اِدھر اُدھر دیکھنے لگی۔ آخر بڑی مشکل سے اُسے نظر آیا کہ کوئی چھوٹی سی چیز اُس کے بستر پر چڑھنے کی کوشش کر رہی ہے۔ اُس نے جُھک کر دیکھا تو ایک دم اُچھل پڑی۔ "ارے! یہ تو وہی بلونگڑا ہے!"۔

"ارے تم!" مریم نے حیرت سے کہا "میرا تو خیال تھا کہ امّی نے تمہیں رات باورچی خانے میں بند کر دیا ہوگا۔ شاید وہ بھول گئیں۔ چلو، اگر وہ تمہیں بند کرنا بھول گئی تھیں تو تم اُنہی کے کمرے میں چلے جاتے یا نبیل بھائی کے کمرے میں سو جاتے۔ یہاں کیوں آ گئے؟ نبیل بھائی کو تو تم اچّھے بھی لگتے ہو"۔

بلُونگڑا بھلا کیا جواب دیتا۔ ہاں، مریم یہ باتیں کر رہی تھی تو وہ اُس کے پلنگ پر چڑھنے میں کام یاب ہو گیا تھا۔ اُس نے سوچا کہ وہ بلونگڑے کو پاؤں سے دھکیل کر نیچے گرا دے۔ اُس نے اپنا دایاں پاؤں اُوپر کو اُٹھایا، لیکن پھر اُسے خیال آیا کہ بے چارہ بلونگڑا اِتنی محنت سے تو اُوپر آیا ہے۔ اگر وہ چند مِنَٹ یہاں بیٹھا رہے تو کوئی حرج نہیں۔ بلونگڑا شاید اُس کے خیالات کو سمجھ گیا تھا۔ اُس نے اُس کے پاؤں کو سُونگھا اور پھر ہلکے سے بولا "می--- اِی---رِای--- آؤں"

"اچّھا، اچّھا، ٹھیک ہے۔" مریم نے کہا "زیادہ خوشامد کرنے کی ضرورت نہیں۔ اگر تم چاہو تو میری پائینتی پر سو سکتے ہو"۔

جلد ہی اُس کی آنکھ لگ گئی اور اُس نے خواب میں دیکھا کہ بلونگڑا بڑے پیار سے اُس کا پاؤں چاٹ رہا ہے۔ مگر یہ کیا؟ اچانک اُس کی آنکھ کُھل گئی۔ بلونگڑا تو سچ مُچ اُس کے پاؤں سے لپٹا ہُوا تھا۔

"اب کیا ہے، بھئی؟" مریم نے کہا "میں نے تمھیں نیچے نہیں پھینکا۔ اور کیا چاہتے ہو تم؟ اچھّا، تم بچّوں سے ڈرتے نہیں ہو۔ اُنھیں پیار کرتے ہو۔ اچھّا، اِدھر آجاؤ--- آؤ--- آؤ" اُس نے ہاتھ سے اِشارہ کرتے ہوئے کہا۔

بلونگڑا تو جیسے اِسی انتظار میں تھا۔ وہ آہستہ سے اُٹھا اور اُس کے تلوے چاٹنے لگا۔

"ارے، بس بس۔ میرے پاؤں میں گُدگُدی ہو رہی ہے" مریم نے پاؤں سُکیڑتے ہوئے کہا۔ اب بلونگڑا آگے بڑھ کر اُس کے ہاتھ کے پاس آکر بیٹھ گیا۔

"بس نخرے نہ دکھاؤ" مریم نے کہا "کل صبح ہم تمھیں فاروقی آنٹی کے ہاں چھوڑ آئیں گے۔ اب سو جاؤ"۔

بلونگڑا بڑے پیار سے اُس کے ہاتھ کی اُنگلیاں سُونگھ رہا تھا۔ پھر اُس نے اُس کی اُنگلیوں کو چاٹنا شروع کر دیا۔

"ارے ہٹو بھی" مریم بولی "میں کیا تمھاری امّی ہوں جو تم اِتنا لاڈ کر رہے ہو مجھ سے؟"

مریم کو اچانک خیال آیا کہ آخر اِس بلونگڑے کی بھی تو کوئی ماں ہوگی؟ اور نہ جانے وہ کہاں ہوگی؟ زندہ بھی ہوگی یا کسی کار یا ٹرک کے نیچے آکر مرگئی ہوگی؟ یہ بلونگڑا عام سا تو ہے مگر اپنی ماں سے اِسے کتنا پیار ہوگا۔ شاید وہ اُسے اپنی ماں سمجھ رہا ہے۔ کتنے پیار سے اُس کے ہاتھ پاؤں چاٹ رہا ہے۔ اب بلونگڑا بڑے پیار سے اُس کے ساتھ لگ کر لیٹ گیا تھا۔

"اب تم اِتنے بُرے بھی نہیں ہو" مریم نے کہا "نہ جانے کیوں، تم مجھے اچھّے لگنے لگے ہو"۔

اُس نے بلونگڑے کو پیار سے تھپ تھپایا اور بلونگڑے نے بڑے پیار سے کہا "مِی--- اِی--- اِی--- اِی--- آؤں"۔ نہ جانے کب مریم کو نیند آگئی۔

"مریم! مریم! اُٹھو بھئی، صبح ہوگئی ہے" امّی نے اُسے آواز دی۔ مریم آنکھیں ملتے ہوئے اُٹھی تو اُس نے دیکھا کہ دو ننھّی مُنّی سی آنکھیں اُسے دیکھ رہی ہیں۔ یہ بلونگڑے کی آنکھیں تھیں۔

"ارے! یہ بلونگڑا تمھارے بستر میں کس وقت آگھسا؟ چلو، جلدی اُٹھو۔ ناشتے سے فارغ ہو کر ہمیں اِس کو بیگم فاروقی کے گھر چھوڑ کے آنا ہے" امّی نے کہا۔

"بیگم فاروقی کے گھر چھوڑ کے آنا ہے؟" مریم نے سوچا "بلونگڑے کو؟ اِس ننھّے مُنّے بلونگڑے کو، جس کی نہ ماں کا پتا ہے نہ باپ کا۔ جو اِس دنیا میں اکیلا اور بے سہارا ہے۔ اگر فاروقی آنٹی نے اِسے نہ رکھا تو کیا ہوگا؟ کوئی کتّا کھا جائے گا اِسے"۔ وہ ایک دم اُٹھ کر بیٹھ گئی اور بلونگڑے کو اپنی گود میں لے لیا۔ بلونگڑا بہُت خوش تھا۔ اُس کی باچھیں کِھلی جا رہی تھیں۔ وہ پیار سے خُر خُر کر رہا تھا۔

"کیوں بھئی، بلونگڑے؟" مریم نے بلونگڑے کو چھیڑتے ہوئے کہا "جاؤ گے بیگم فاروقی کے پاس؟" بلونگڑے نے ہلکے سے خُر خُر کی آواز نکالی۔ مریم بولی "امّی، یہ کہ رہا ہے میں نہیں جاؤں گا"۔

"لیکن تم تو کل کہ رہی تھیں کہ یہ ایک عام سا بلونگڑا ہے۔ تمھیں اچھّا نہیں لگتا" امّی نے حیرت سے کہا۔

"نہیں، امّی" مریم نے کہا "صرف برمی یا ایرانی بلّیاں ہی پیاری نہیں ہوتیں، میرا یہ عام سا بلونگڑا بھی بہُت پیارا ہے--- شہزادی جیسا پیارا۔ میں اِس کا نام شہزادہ رکھوں گی۔ کیوں بلونگڑے؟ اوہو! کیوں شہزادے؟ تمھیں یہ نام اچھّا لگا؟"

بلونگڑا مریم کی بات سمجھ گیا تھا۔ اُس نے پیار سے مریم کا ہاتھ چاٹا اور بڑی نرمی سے بولا "مِی--- اِی--- اِی--- اِی--- آؤں!"

امّی مریم کی طرف دیکھ کر مسکرانے لگیں۔

(سینڈرا بیس وِتھ رُک کی کہانی "این آرڈی نری کیٹ" سے ماخوذ)۔

سید نظر زیدی

تیلا پہلوان

وہ بہت کم زور اور دُبلا پتلا تھا۔ ہمارے اِسکول میں دُبلے پتلے اور لڑکے بھی تھے، لیکن وہ کچھ زیادہ ہی دُبلا تھا اور شاید اِسی وجہ سے شریر لڑکوں نے اُس کا نام تیلا پہلوان رکھ دیا تھا۔

کسی کا بُرا نام رکھ دیا جائے تو اُسے ضرور بُرا لگتا ہے۔ غُلام حُسین کو بھی اپنا یہ نام بہت بُرا لگتا تھا۔ لیکن چوں کہ وہ کم زور ہونے کے ساتھ غریب بھی تھا اِس لِیے کچھ کر نہ سکتا تھا۔ کوئی اُسے تیلا پہلوان کہتا تو غصّے سے گھورتا اور نچلا ہونٹ دانتوں میں دبا لیتا۔ لیکن ایک دن نہ جانے کیا ہوا، شریف احمد نے تیلا پہلوان کہ کر چھیڑا تو وہ یُوں اُس پر جھپٹ پڑا جیسے بلّی چوہے پر جھپٹتی ہے۔ لیکن اِس بہادری کا نتیجہ بھی اُس کے خلاف ہی نکلا۔ شریف نے اِس زور سے اُسے دھکّا دیا کہ غریب لڑھکنیاں کھاتا ہوا دور جاگرا اور زور زور سے رونے لگا۔

اب تک یہ بات یعنی لڑکوں کا غلام حُسین کو تیلا پہلوان کہنا اور اُس کا غصّہ ظاہر کرنا طالب علموں کے درمیان ہی رہتی تھی۔ اِسکول کا کوئی اُستاد اِس کے بارے میں کچھ نہ جانتا تھا۔ لیکن آج یہ چُپکے چُپکے ہونے والی شرارت ظاہر ہوگئی۔ یہ پیریڈ مولوی سلامتُ اللہ صاحِب کا تھا۔ وہ عین اُس وقت کمرے میں داخل ہوئے جب غُلام حُسین اُونچی آواز میں رو رہا تھا۔ مولوی صاحِب اپنی کرسی کی طرف بڑھنے کی بجائے سیدھے اُس کے پاس گئے اور بولے "کیوں بیٹے، کیا ہوا؟ اِس طرح کیوں رو رہے ہو؟ کیا کسی نے مارا ہے؟"

وہ جو کسی نے کہا ہے کہ چور کی ڈاڑھی میں تِنکا، تو غلام حسین کے بولنے سے پہلے شریف نے اُونچی آواز میں کہا "جناب، اِس نے مجُھ پر حملہ کیا تھا۔ میں نے پرے ہٹایا تو گر گیا اور رونے لگا"۔

مولوی صاحِب نے شریف کی طرف دیکھا اور ناراض ہو کر بولے "بہت خوب! اِس نے تم پر حملہ کیا تھا یعنی بکری نے شیر پر حملہ کر دیا تھا۔ ہمارے پاس آؤ اور پوری بات بتاؤ۔ تم نے کیا حرکت کی تھی؟"

شریف اُٹھ کر مولوی صاحِب کے پاس گیا اور انُھوں نے مُقدّمے کی تفتیش شروع کر دی۔ اُنھیں بڑی آسانی سے یہ بات معلوم ہوگئی کہ شریر لڑکے غلام حسین کو تیلا پہلوان کہ کر چھیڑتے ہیں اور شریف اِن شریروں کی

ٹولی کا سردار ہے۔ آج بھی اُس نے غلام حُسین کو تیلا پہلوان کہا تھا۔ اِس پر اُسے غصّہ آگیا اور وہ شریف سے اُلجھ پڑا۔ شریف نے اُسے دھکّا دیا جس سے اُسے چوٹ لگی اور وہ رونے لگا۔

ساری باتیں سُن کر مولوی صاحب کچھ دیر سوچتے رہے۔ پھر شریف کو حکم دیا "تم اِسی وقت کلاس سے نکل جاؤ، اور کل اپنے والِد صاحب کو لے کر آنا۔ اگر اُنھوں نے ہمیں اِطمینان دِلا دیا کہ آیندہ تم صِرف نام کے شریف نہیں، بلکہ سچ مُچ کے شریف بن کر رہو گے تو تمھیں کلاس میں بیٹھنے کی اِجازت دیں گے، ورنہ اِسکول سے تمھارا نام کٹوا دیں گے۔ بدنصیب لڑکے! تمھیں کسی نے یہ نہیں بتایا کہ طاقت وروں کو کم زوروں کی مدد کرنی چاہیے؟ تم اُلٹا اُنھیں ستاتے ہو"۔

شریف نے اپنی کتابیں اور کاپیاں سمیٹیں اور کلاس روم سے نکل گیا۔

شریف کے جانے کے بعد مولوی صاحب غلام حُسین کا ہاتھ پکڑ کر اپنی میز کے قریب لے آئے اور کُرسی پر بیٹھ کر رومال سے عینک کے شیشے صاف کرتے ہوئے بولے "بچّو، آج کا سبق شروع کرنے سے پہلے ہم تمھیں چند خاص باتیں بتانا چاہتے ہیں۔ غور سے سُنو گے اور اُن پر عمل بھی کرو گے تو شان دار کام یابیاں حاصل کرنے میں تمھیں بہت مدد ملے گی"۔

"جی، ہم غور سے سُنیں گے اور اُن پر عمل بھی کریں گے" بچّوں نے ایک آواز ہو کر کہا۔ اُن کا شور کم ہوا تو مولوی صاحب نے یُوں بات شروع کی "عزیز بچّو، پہلی بات تو یہ ہے کہ یہ جان کر ہمیں بہت رنج ہوا کہ تم اپنے ساتھی غلام حُسین کو تیلا پہلوان کہہ کر چھیڑتے ہو۔ ایسا کرنا بہت بڑا گُناہ ہے۔ ہمارے دِین اِسلام کا حکم تو یہ ہے کہ اپنے دوستوں اور عزیزوں کو، بلکہ سبھی کو اچھّے ناموں سے بُلانا چاہیے۔ کسی کا نام بگاڑنا نہیں چاہیے۔ یہ حکم اِس لیے دیا گیا ہے کہ جب کسی کو اچھّے نام سے بُلائیں تو وہ خوش ہوتا

ہے۔ بُرے نام سے بُلائیں تو وہ ناراض ہوتا ہے اور اُس کے دل میں ایسے آدمی کے لِئے نفرت پیدا ہوتی ہے جس نے اُس کا نام بگاڑا ہو۔ اور کبھی تو بات لڑائی جھگڑے تک پہنچ جاتی ہے جیسے ابھی تھوڑی دیر پہلے ہُوا۔ کیوں ٹھیک ہے ناں؟"

"جی، بالکُل ٹھیک ہے" بچّوں نے کہا۔

مولوی صاحِب نے پھر بات شروع کی "اچھا بھئی، بچو۔ ایک بات تو یہ ہوئی۔ ہم اُمّید کرتے ہیں کہ آیندہ تم میں سے کوئی یہ گُناہ نہیں کرے گا۔ دوسری بات یہ ہے کہ ہر بچّے کو ایسی اچھّی حالت میں رہنا چاہیۓ کہ کسی کو اُس کا نام بگاڑنے کی ہمّت ہی نہ ہو۔ مثال کے طور پر اپنا لباس صاف سُتھرا رکھنا چاہیۓ۔ کتابوں اور کاپیوں پر داغ دھبّے نہیں لگنے دینے چاہئیں۔ مسخروں کی طرح اُلٹی سیدھی باتیں نہیں کرنی چاہئیں۔ لڑائی جھگڑوں سے بچنا چاہیۓ۔ خوب محنت اور شوق سے تعلیم حاصل کر کے اپنی قابلِیّت بڑھانی چاہیۓ۔ جو بھی ایسا کرے گا، وہ سب کو اچّھا لگے گا۔ اُس کے دُشمن بھی اُس کا مذاق نہ اُڑا سکیں گے"۔

"لیکن جناب، میں تو یہ سب کام کرتا ہوں، اور یہ لوگ پھر بھی مجھے تیلا پہلوان کہہ کر چھیڑتے ہیں" غلام حسین نے کہا۔

مولوی صاحِب نے پیار سے اُس کے سر پر ہاتھ رکھا اور تسلّی دیتے ہوئے بولے "بیٹے، ہم کہہ چکے ہیں کہ جو بچّے ایسا کرتے ہیں، وہ اچھے بچّے نہیں ہیں۔ اُنہیں گُناہ ہوتا ہے، جس کی اُنہیں سزا ملے گی۔ لیکن پیارے بیٹے، اِس میں تھوڑا سا قصوُر تمہارا بھی ہے"۔

"جی، میرا کیا قصوُر ہے؟ میں تو اِن لوگوں سے بات تک نہیں کرتا" غلام حسین نے کہا۔ اُس کی آنکھوں میں آنسوُ آگئے تھے۔

"تمہاری غلَطی یہ ہے بیٹے، کہ تم بہُت کم زور اور دُبلے پتلے ہو۔ ہم مانتے ہیں کہ کچھ باتیں اللہ کی طرف سے ہوتی ہیں، جیسے کسی کا رنگ کالا ہے اور کسی کا گورا۔ کوئی چھوٹے قد کا ہے اور کسی کا قد لمبا ہے وغیرہ وغیرہ۔ لیکن کم زور اور دُبلا پتلا ہونا ایک ایسی بات ہے جس کا تعلّق زیادہ تر آدمی کی اپنی نالائقی اور بے وقوفی سے ہے" مولوی صاحِب نے بات ختم کر کے غلام حُسین کی طرف یوں دیکھا جیسے کہہ رہے ہوں کہ تم ایسے ہی نالائق اور بے وقوف ہو۔

غلام حسین حیران ہو کر بولا "وہ کیسے، جنابِ عالی؟"

"وہ ایسے برخوردار کہ اللہ پاک نے تمام اِنسانوں کو ہاتھ پاؤں اور کان ناک کی طرح بدن کے دوسرے حصّے بھی ایک جیسے دِیے ہیں۔ کوئی امیر کے گھر پیدا ہو یا غریب کے، یہ حصّے سب کے ایک سے ہوتے ہیں اور خون کا رنگ بھی سب کا ایک جیسا ہی ہوتا ہے۔ اُن کی حالت میں اگر فرق آتا ہے تو اُن کی سمجھ داری یا بے وقوفی کی وجہ سے ۔ بے وقوف چٹورے بن کر الّم غلّم چیزیں کھاتے ہیں، یا ضرورت کے مُطابق پوری خوراک نہیں کھاتے اور یوں کم زور اور دُبلے پتلے رہ جاتے ہیں۔ اِن کے مُقابلے میں عقل مند کھانے پینے کے مُعاملے میں اپنے ماں باپ کے کہنے پر چلتے ہیں اور ورزشی کھیلوں میں حصّہ لے کر طاقت ور بن جاتے ہیں"۔

جس وقت مولوی صاحِب یہ باتیں بتا رہے تھے، غلام حسین کو یاد آ رہا تھا کہ وہ سچ مچ چٹورا اور کم سمجھ ہے۔ اُس کی امّی جان خوشامدیں کر کر کے تھک جاتی ہیں، لیکن وہ پورا ناشتا نہیں کرتا۔ دودھ پینے سے تو جیسے اُسے چڑ ہے۔

یہ باتیں یاد کر کے وہ جلدی سے بولا "تو جناب، اگر میں اچّھی طرح کھاؤں اور کھیلوں میں حصّہ لُوں تو دوسرے لڑکوں کی طرح طاقت ور بن سکتا ہُوں؟"

مولوی صاحِب مسکرا کر بولے "کیوں نہیں۔ اگر تم اپنی امّی جان کے ہاتھ کا پکا ہُوا کھانا پیٹ بھر کر اور وقت پر کھاؤ اور ہاکی، فُٹ بال اور کرکٹ وغیرہ کھیلوں میں حصّہ لو تو چند دنوں میں دوسرے بچّوں جیسے گول مٹول اور طاقت ور بن سکتے ہو۔ پھر تمہارا حافِظہ بھی اچّھا ہو جائے گا، یعنی سبَق تمہیں بالکُل آسانی سے یاد ہو جایا کرے گا اور تم بہُت

اچھے نمبر لے کر پاس ہُوا کرو گے۔ بُزرگوں نے کہا ہے کہ صحت مند جسم میں ہی صحت مند دماغ ہوتا ہے۔ وعدہ کرو، اب ایسا ہی کرو گے"۔

"جی، میں پکا وعدہ کرتا ہوں" غُلام حُسین نے سر اُونچا کر کے اور سینہ تان کر کہا۔ اُس کے چہرے پر رونق آگئی تھی۔

مولوی صاحب نے اُسے شاباش دی اور سبق پڑھانے لگے۔

پیارے بچّو، یہ سچّا واقعہ نہیں۔ مطلب یہ کہ ہم نے سچ مُچ کے کسی تیلا پہلوان کو نہ دیکھا تھا کہ اُس کے واقعات لِکھ دیے۔ بلکہ یہ بھی دوسری کہانیوں کی طرح کی ایک کہانی ہے، لیکن اِس میں جو باتیں بتائی گئی ہیں وہ بالکل سچّی ہیں۔ اگر کوئی بچّہ اپنی کم سمجھی کی وجہ سے اپنی امّی جان کا کہنا نہ مانتا ہو اور وقت پر پورا کھانا کھانے کے بجائے بازار کی چٹ پٹی چیزیں اُڑاتا ہو اور کھیلوں میں حصّہ نہ لیتا ہو تو وہ واقعی تیلا پہلوان بن جائے گا اور سب اُس کا مذاق اُڑائیں گے۔ لیکن اگر وُہی بچّہ اِس کہانی کے غُلام حُسین کی طرح اپنی عادتیں ٹھیک کرلے گا تو چند ہی دن میں ایک خوب صورت اور طاقت ور بچّہ بن جائے گا۔

صحت کو اچھا رکھنے اور بگڑی ہوئی صحت کو اچھا بنانے کی طرح دوسری باتوں میں بھی اِسی طرح کام یابی حاصل کی جا سکتی ہے۔ خوب محنت اور شوق سے سبق یاد کرنے والے بچّے قابل بن کر اُونچے افسر بن جاتے ہیں اور ایسا نہ کرنے والے فیل ہو کر اِن افسروں کی میزیں صاف کرتے ہیں۔ رہی تقدیر کی بات تو اللہ پاک نے اپنی سچّی کتاب قُرآن میں بتا دیا ہے کہ جو جتنی محنت کرتا ہے، اُس کا اجر پاتا ہے۔

سِلائی کی مشین

کپڑا سینے کی مشین 1830ء میں تھیونیئر نامی ایک فرانسیسی نے اِیجاد کی تھی۔ یہ مشین پوری کی پوری لکڑی کی تھی۔ مگر اِس کے مُوجد کو نہ شُہرت ملی، نہ کوئی صِلہ ملا بلکہ اِس اِیجاد کی وجہ سے اُس کی جان پر بن گئی۔

1840ء کی بات ہے، پیرس کے ایک کارخانے میں تھیونیئر کی مشینوں پر فوجی وردیاں سی جا رہی تھیں کہ شہر کے درزیوں نے کارخانے پر ہلّا بول دیا۔ اُن کا خیال تھا اِن مشینوں کی وجہ سے وہ روزگار سے محروم ہو جائیں گے۔ انُھوں نے سب مشینیں توڑ پھوڑ ڈالیں اور تھونیئر کو بھی مارا پیٹا۔

اور بہت سے مُوجد بھی سِلائی کی مشین بنانے کی فکر میں تھے۔ 1832ء کے لگ بھگ ایک امریکی، ایلیاس ہاؤ، نے ایسی سُوئی بنائی جس کا ناکا اُس کی نوک پر تھا۔ اِس تبدیلی سے سلائی کی مشینوں سے زیادہ کپڑا سلنے لگا۔

ڈیوی سیفٹی لیمپ

جب مزدور کوئلے کی کانوں میں کام کرتے ہوتے ہیں تو اُس وقت یہ خطرہ ہوتا ہے کہ کہیں کوئلے کی گیس تنگ راستوں میں جمع نہ ہو جائے۔ یہ گیس شُعلہ یا چنگاری لگتے ہی جل اُٹھتی ہے اور ایک خوف ناک دھماکا ہوتا ہے۔ کانوں میں بڑی اِحتیاط کی جاتی ہے، پھر بھی حادثے ہو جاتے ہیں۔

پُرانے زمانے میں کانوں میں روشنی کرنے کے لِیے ایسے سب طریقے آزمائے گئے جن سے حادِثہ نہ ہو۔ مثلاً بڑے بڑے آئینوں کے ذریعے سورج کی شُعاعیں اندر ڈالی گئیں۔ مچھلی کے چمک دار چھِلکے اِستعمال کِیے گئے۔ مگر یہ طریقے بھروسے کے نہ تھے۔

1815ء میں سر ہمفری ڈیوی نے ڈیوی سیفٹی لیمپ ایجاد کر کے یہ مشکل حل کر دی۔ یہ مٹّی کے تیل کا لیمپ تھا جس کے گرد ایک شفّاف جالی لگی تھی۔ اِس سے گیس کو آگ نہیں لگ سکتی تھی۔

کوئلے کی کانوں میں بجلی کی روشنی کے رواج سے پہلے یہی لیمپ اِستعمال کیا جاتا تھا۔

حفیظ الرّحمٰن احسن

23 مارچ

آج کے روز نیا عزم کیا تھا ہم نے
اپنے گھر، اپنی زمیں، اپنے وطن کی خاطر
اپنے پھولوں کے لیے، اپنے چمن کی خاطر
اپنی عزّت کے لیے، قومی لگن کی خاطر
آج کے روز نیا عزم کیا تھا ہم نے

اپنے قائد کی قیادت میں چلے تھے مِل کر
پھر سے اِسلام کی وحدت میں ڈھلے تھے مِل کر
اپنی منزل کی طرف سارے بڑھے تھے مِل کر
آج کے روز نیا عزم کیا تھا ہم نے

آج پھر ایک نیا عزم ہمیں کرنا ہے
رنگ آزادی کے نقشے میں ابھی بھرنا ہے
اِس کو ہر خطرے سے محفوظ ابھی کرنا ہے
مُشکلیں کتنی بھی ہوں، اُن سے نہیں ڈرنا ہے
آج کے روز نیا عزم کیا تھا ہم نے

بند دروازہ

محمد یونس حسرت

شہزادی عالیہ کی تاج پوشی اگلے دن تھی۔ تاج پوشی کے بعد اُسے شہزادی عالیہ سے ملکہ عالیہ بن جانا تھا۔ مگر اِس تبدیلی کے واقع ہونے میں ابھی چوبیس گھنٹے باقی تھے۔ اِس وقت تو وہ اپنے بوڑھے اُستاد' ارسطو' کے سامنے بیٹھی تھی اور پاس پڑے ہوئے کتابوں کے ڈھیر کو بیزاری اور کسی حد تک نفرت سے دیکھ رہی تھی۔

"کیا اب بھی مجھے اِن کتابوں کے ساتھ سر کھپانے کی ضرورت ہے؟ کل تو میں ملکہ بن جاؤں گی۔ ملکہ کی حیثیّت سے میرے کچھ وزیر بھی ہوں گے۔ ٹھیک ہے ناں؟"

بوڑھے ارسطو نے اپنی پیٹ تک لمبی ڈاڑھی کو بائیں ہاتھ سے سہلاتے اور دائیں ہاتھ سے ناک پر چشمے کو دُرست کرتے ہوئے ہاں کے انداز میں سر ہلایا۔

"یہ بات ٹھیک ہے تو پھر مجھے یہ کتابیں پڑھنے کی کیا ضرورت ہے؟ میرے وزیر مجھے ہر وہ بات بتائیں گے جس کے جاننے کی مجھے ضرورت ہے"۔

"یقیناً بتائیں گے" بوڑھے ارسطو نے کہا "مگر آخری فیصلہ تو آپ کو کرنا ہوگا۔ وزیر آپ کو جو رائے دیں گے، اس میں اُن کا کچھ اپنا ذاتی مقصد یا فائدہ بھی ہو سکتا ہے۔ مگر ایک ملکہ کی حیثیّت سے آپ کو اپنے دِل اور اپنے دماغ پر بھروسا کرنا ہوگا اور اپنے آپ کو اِس قابل بنانا ہوگا کہ وزیروں کی بات سُن لینے کے بعد آپ اُس مُعاملے کے بارے میں ایک صحیح اور جچا تُلا فیصلہ کر سکیں۔۔۔۔ اور یہ کتابیں یہی بات آپ کو سکھائیں گی"۔

"آپ کی بات کچھ ٹھیک ہی لگتی ہے" شہزادی عالیہ نے بیزاری سے کہا۔

"اِس کے عِلاوہ ایک بات اور بھی ہے" بوڑھے ارسطو نے اپنی لمبی ڈاڑھی سہلاتے ہوئے کہا "آپ کو ابھی ایک اِمتحان بھی پاس کرنا ہے' تاکہ یہ ثابت ہو سکے کہ آپ واقعی حکومت کرنے کے قابل ہیں"۔

"اِمتحان؟ کیسا اِمتحان؟" شہزادی نے حیران ہو کر پُوچھا۔

"اوہ!" بوڑھے ارسطو نے افسوس سے ہاتھ ملتے ہوئے کہا "مجھے یہ بات نہیں کہنی چاہیے تھی"۔

شہزادی عالیہ اُٹھ کھڑی ہوئی۔ اُس نے بوڑھے ارسطو

کا بازو تھام لیا اور شکایت بھرے انداز میں کہا "ہو سکتا ہے آپ کا یہ کہنا درست ہو کہ آپ کو یہ بات نہیں کہنی چاہیے تھی۔ مگر اب جو آپ نے کہہ ہی دی ہے تو ذرا کھول کر بتایئے۔ حساب؟ جغرافیہ؟ کشیدہ کاری؟ شمشیر زنی؟ گھڑ سواری؟ کس قسم کا امتحان ہوگا؟"

"میں پہلے ہی بہت کچھ کہہ چکا ہوں" ارسطو نے اپنا بازو چھڑاتے ہوئے کہا۔ پھر وہ دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے بولا "میں آپ کو اور کچھ نہیں بتا سکتا"۔

"ایک بات، صرف ایک بات بتا دیجیے" شہزادی نے کہا "بڑی مہربانی ہوگی"۔

بوڑھا ارسطو نہ چاہتے ہوئے بھی رک گیا اور پلٹ کر کہنے لگا "کیا چاہتی ہیں آپ؟"

"میں یہ جاننا چاہتی ہوں کہ کیا ہماری سلطنت کے ہر بادشاہ کو یہ امتحان دینا پڑتا ہے؟"

"ہاں" ارسطو نے جواب دیا "جب سے یہ سلطنت قائم ہوئی ہے، اس کے تمام بادشاہ یہ امتحان دیتے رہے ہیں"۔

شہزادی عالیہ کے لیے ارسطو کی بات پر شک کرنے کی کوئی وجہ نہ تھی۔ بوڑھا ارسطو اس کے باپ کا استاد تھا۔ وہ اس کے دادا کا بھی استاد رہا تھا اور عین ممکن ہے کہ اس کے پردادا کا بھی استاد رہا ہو۔ اس کا وجود تو شاید وقت کی قید سے آزاد تھا۔ شہزادی کچھ ہچکچائی اور پھر کوشش کر کے بات اپنی زبان پر لے آئی "کیا کوئی بادشاہ اس امتحان میں ناکام بھی ہوا ہے؟"

ارسطو نے جان بوجھ کر منہ دوسری طرف پھیر لیا اور کہا "ہاں--- چند ایک ناکام بھی ہوئے ہیں"۔

شہزادی بولی "مگر میں نے تو کبھی نہیں سنا کہ ہمارے خاندان کا کوئی شخص سلطنت کا بادشاہ بننے میں ناکام رہا ہو۔ سب ملکہ یا بادشاہ بنتے آئے ہیں۔ صرف وہی بادشاہ نہیں بن سکے جو تاج پوشی سے پہلے فوت ہو گئے تھے اور وہ---"

شہزادی عالیہ کہتے کہتے رک گئی، جیسے اپنی بات کہنے کے لیے مناسب الفاظ سوچ رہی ہو۔ پھر اس نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا "اور وہ پراسرار طور پر فوت ہوتے رہے ہیں"۔

"وہ امتحان میں ناکام ہو گئے تھے" بوڑھے ارسطو نے کہا اور تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا وہاں سے چلا گیا۔

شہزادی عالیہ اسے جاتے دیکھتی رہی۔ پھر وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتی ہوئی کھڑکی کے پاس آکھڑی ہوئی اور باہر دیکھنے لگی۔

"وہ امتحان میں ناکام رہے تھے" وہ اپنے آپ سے کہنے لگی "لیکن وہ کیا امتحان تھا، اور وہ اس امتحان میں کیسے ناکام رہے تھے؟"

شہزادی کھڑکی سے پلٹ آئی اور اپنی کتابیں لے کر بیٹھ گئی۔ مگر پڑھنے میں اس کا جی بالکل نہیں لگ رہا تھا۔ وہ اپنے والدین کے بارے میں سوچنے لگی۔ وہ کشتی میں سمندر کی سیر کرنے گئے تھے کہ سمندر میں طوفان آگیا اور ان کی کشتی طوفان میں گھر کر ڈوب گئی۔ کشتی کے ساتھ اس کے والدین اور ملاح بھی سمندر کی تہ میں پہنچ گئے تھے۔ اس بات کو تین مہینے ہو چلے تھے اور وہ ان تین مہینوں میں اپنے ماں باپ کو یاد کر کر کے روتی رہی تھی۔ اسے کبھی اپنی ماں کی محبت بھری گود یاد آتی تو کبھی اپنے باپ کی شفقت بھری نگاہیں۔ وہ اپنے آپ کو سارے عیش و آرام کے باوجود تنہا تنہا اور بے سہارا محسوس کر رہی تھی۔

شام کا کھانا اگرچہ باورچی نے پہلے کی طرح بڑی محنت سے تیار کیا تھا اور اس میں اس کی پسندیدہ چیز، بھنی ہوئی مرغابی، شامل تھی مگر وہ فکرمندی کے باعث ٹھیک سے کھا نہ سکی۔ دو لقمے لے کر ہی اس نے ہاتھ کھینچ لیا اور بے چینی سے کمرے میں ٹہلنے لگی۔ آخر اس نے شب خوابی کا لباس بدلا اور اپنے نرم نرم، ملائم اور آرام دہ بستر میں گھس گئی۔ مگر بوڑھے ارسطو کی بات اسے برابر پریشان کر رہی تھی۔

"تاج پوشی تو کل ہونی ہے۔ پھر یہ امتحان کب ہوگا؟ شاید بوڑھے ارسطو کو غلطی لگی ہے۔ شاید کوئی امتحان ہے

ہی نہیں---- ہوگا ہی نہیں" یہی باتیں سوچتے ہوئے وہ نیند کی آغوش میں پہنچ گئی۔

جب اُس کی آنکھ کُھلی تو کلاک بارہ بجا رہا تھا' اور شہزادی عالیہ کو یوں لگا تھا جیسے کسی نے اُس کا نام لے کر آواز دی ہے۔ مگر اپنی خواب گاہ میں تو وہ اکیلی ہی تھی۔ اُسے آواز دینے والا کہیں دکھائی نہ دیتا تھا۔ آتش دان میں جلتی ہوئی آگ کسی قدر مدّھم ہو چکی تھی اور اُس کے شعلے فرش پر ایسے سائے بنا رہے تھے جو بھوتوں کی طرح آپس میں گڈمڈ ہوتے دکھائی دیتے تھے۔ وہ بستر سے نکل آئی تاکہ آتش دان میں کچھ اور لکڑیاں ڈال دے۔

فرش پر قدم رکھتے ہی وہ کانپ سی گئی۔ نہ جانے کیوں اُسے یوں محسوس ہوا جیسے شاہی محل ایک دم بہت سے بھوتوں سے بھر گیا ہے' اور یہ بھوت خاموش اور پُراسرار سایوں کی طرح اِدھر اُدھر دوڑتے بھاگتے اور ناچتے کودتے پھر رہے ہیں۔ راہ داری کی طرف سے اُسے ایک آہٹ سی سُنائی دی تو وہ اُس طرف لپکی اور اپنی خواب گاہ کے دروازے میں کھڑے ہو کر باہر جھانکا۔

راہ داری میں جلتی ہوئی کافوری شمعیں ہوا سے یوں لہرا رہی تھیں جیسے پریاں ناچ رہی ہوں۔ ہوا کی ایک لہر شہزادی عالیہ کے چہرے سے ٹکرائی اور اُس کے لمبے لمبے بالوں کو اُس کے کندھوں اور چہرے پر بکھرا گئی۔ اپنے چہرے سے بال ہٹاتے ہوئے اُس نے سامنے دیوار کی طرف دیکھا تو اُس میں ایک بڑا سا دروازہ کُھلا دکھائی دیا۔

وہ حیران رہ گئی۔ اِس دروازے کو اُس نے بیسیوں نہیں' سینکڑوں بار دیکھا تھا اور وہ ہمیشہ بند ہوتا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کسی شخص کے پاس اِس دروازے کی چابی نہیں ہے۔ مگر اب یہ دروازہ کُھلا تھا اور پاٹوں پاٹ کُھلا تھا۔

شہزادی عالیہ نے سوچا کہ کہیں یہ خواب تو نہیں ہے؟

اُس نے دونوں ہاتھوں سے اپنی آنکھوں کو ملا اور پھر اُدھر نگاہ کی۔ دروازہ اُسی طرح پاٹوں پاٹ کُھلا تھا۔

شہزادی نے اپنے شب خوابی کے لباس کو سنبھالا، تیز تیز قدم اُٹھاتی ہوئی اُس دروازے کے پاس گئی اور پھر اُس کے اندر جھانکا۔ اندر سیڑھیاں بنی ہوئی تھیں جو بل کھاتی ہوئی اُوپر کی طرف جا رہی تھیں۔ راہ داری میں جلتی ہوئی کافوری شمعوں کی روشنی اُن سیڑھیوں پر پڑ رہی تھی۔ اُس سے اُن پر ایسے سائے سے بن رہے تھے جیسے کسی خانقاہ کے درویش جلوس بنائے چل رہے ہوں۔ شہزادی کانپ سی گئی، مگر اُس نے حوصلے سے کام لیا۔ دل کو سنبھالا، راہ داری کے شمع دان سے ایک شمع اُتار کر ہاتھ میں لی اور سیڑھیاں چڑھنے لگی۔

سیڑھیوں کے آخر میں ایک چبوترا سا بنا ہوا تھا جس پر دو دروازے دکھائی دے رہے تھے۔ دونوں دروازوں میں تالے لگے ہوئے تھے اور اُن کے ساتھ پیتل کی چمک دار چابیاں لٹک رہی تھیں۔ شہزادی نے شمع فرش پر رکھ دی اور پہلی چابی کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

"عالیہ!" دروازے کے پیچھے سے کسی نے آہستہ سے اُس کا نام پُکارا۔

شہزادی کا بڑھا ہوا ہاتھ ایک دم پیچھے ہٹ گیا۔ اُس کا سارا جسم سُن سا ہو گیا اور نیچے کا سانس نیچے اور اُوپر کا اُوپر رہ گیا۔

"عالیہ!" دروازے کے پیچھے سے پھر آواز آئی "یہ دروازہ کھولو اور مجھے باہر نکالو"۔

"تم کون ہو؟" شہزادی نے ڈرتے ہوئے پوچھا۔

"میں کون ہُوں؟" آواز نے جواب دیا "حیرت ہے کہ تم مجھے نہیں جانتیں۔ میں تمہارے دِل کی تمنّا ہوں۔ میں نے اسی لیے تمہیں آواز دی ہے۔ دروازہ کھول کر مجھے باہر نکالو۔ پھر تمہاری آرزو پوری ہو جائے گی"۔

شہزادی عالیہ کے دل میں فوراً اپنے والدین کا خیال آیا، اپنی ماں کی مَحبّت بھری گود اور باپ کی شفقت بھری نگاہیں اُس کے تصوّر میں پھر گئیں۔ وہ سوچنے لگی، اگر میرے ماں باپ پھر سے زندہ ہو جائیں تو میرا سارا مسئلہ حل ہو جائے۔ مجھے اپنی ماں کی مَحبت بھری گود دوبارہ نصیب ہو جائے گی۔ میرا باپ مُلک پر حکومت کرے گا اور میں حکومت کا بوجھ سنبھالنے سے بچ جاؤں گی۔

"ہاں" دروازے کے پیچھے سے آواز آئی "تمہاری یہ تمنّا بھی پوری ہو سکتی ہے۔ میں تمہارے دل کی ہر خواہش پوری کر سکتا ہوں، لیکن اِس جگہ سے آزاد ہونے کے بعد۔ اِس دروازے کے پیچھے قید ہوتے ہوئے میں تمہارے لیے کچھ نہیں کر سکتا۔ تم مجھے اِس قید سے رِہائی دِلاؤ۔ میں تمہیں سلطنت کے بوجھ سے رِہائی دلا دوں گا"۔

یہ سُن کر شہزادی نے ایک سکُون سا محسوس کیا اور دوبارہ چابی کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

"عالیہ!" دوسرے دروازے کے پیچھے سے آواز آئی۔

شہزادی عالیہ کا پہلی چابی کی طرف بڑھا ہوا ہاتھ پھر رُک گیا اور وہ دوسرے دروازے کی طرف رُخ کرتے ہوئے بولی "ہاں"۔

"مجھے باہر نکالو، عالیہ۔ میں تمہیں ایسی قوّت عطا کر دوں گا کہ پھر تمہیں حکومت کا کام کرنے میں کوئی دُشواری اور دِقّت نہیں ہوگی۔ جب میں تمہاری پُشت پر ہوں گا تو تم بڑی آسانی سے حکومت کر سکو گی۔ مجھے رِہا کر دو۔ میری طاقت کے ساتھ مِل کر تمہاری طاقت دُنیا کی سب سے بڑی طاقت بن جائے گی"۔

شہزادی عالیہ کو اپنے اُستاد بوڑھے ارسطو کا خیال آیا۔ اُس نے اسے مُختلف کتابیں پڑھاتے ہوئے نہ جانے کیا کیا باتیں اُس کے دماغ میں ٹھونسنے کی کوشش کی تھی--- یہ کرو، یہ نہ کرو--- ایسا کرنا چاہیے، ایسا نہیں کرنا چاہیے---- لوگوں کے ساتھ یوں پیش آنا چاہیے، یوں پیش نہیں آنا چاہیے---- رعایا کے ساتھ اِس قسم کا سلوک کرنا چاہیے، اِس قسم کا سلوک نہیں کرنا چاہیے۔ اب وہ اِس قسم کی کوئی نصیحت نہیں کرے گا---نہیں کر سکے گا، کبھی نہیں کر سکے گا۔

یہ سوچتے ہوئے شہزادی نے دوسرے دروازے کی چابی کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

"عالیہ!" پہلے دروازے کے پیچھے سے آواز آئی "کیا تم بھول رہی ہو؟ وہ تمہارے دل کی تمنّا، تمہارے والِدین، سلطنت کے بوجھ سے آزادی"۔

"عالیہ!" دوسرے دروازے کے پیچھے سے آواز آئی "کیا تم حکومت کرنے کی طاقت نہیں چاہتیں؟ تمہارے ہونٹوں سے نکلا ہُوا ہر لفظ قانون کا درجہ رکھے گا---- تمہارا ہر فرمان، ہر ارمان بِلا چُون و چرا پورا ہو گا"۔

شہزادی عالیہ نے پہلے تو پہلے دروازے کی طرف دیکھا، پھر دوسرے دروازے کی طرف۔ دونوں دروازوں کی طرف سے آتی ہوئی آوازیں آہستہ آہستہ بلند ہوتی گئیں اور اِن آوازوں نے اُسے ایک طوفان کی طرح اپنے گھیرے میں لے لیا۔ وہ پہلے دروازے کی طرف بڑھتی تو دوسرا دروازہ اُسے اپنی طرف بُلاتا۔ دوسرے دروازے کی طرف بڑھتی تو پہلا دروازہ اُسے اپنی طرف کھینچتا۔ اُسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے آوازوں کے اِس طوفان میں وہ غرق ہوئی جا رہی ہے۔ اُس کا ہاتھ کبھی پہلے دروازے کی چابی کی طرف بڑھتا اور کبھی دوسرے دروازے کی چابی کی طرف۔ آوازوں کا یہ طوفانی شور جب اُس کے لیے ناقابلِ برداشت ہو گیا تو اُس نے اپنے کانوں میں اُنگلیاں ٹھُونس لیں اور گلے کی پُوری قوّت سے چِلّائی:

"خاموش!"

دونوں دروازوں کے پیچھے ایک دم خاموشی چھا گئی۔ آوازوں کا طوفان ایک دم تھم کر غائب ہو گیا۔ شہزادی نے اپنے دونوں ہاتھ نیچے کر لیے اور پھر جیسے اُن دونوں دروازوں سے مُخاطِب ہو کر بولی "میں نے فیصلہ کر لیا ہے"۔

دونوں دروازے اُس کا فیصلہ جاننے کی خاطِر خاموش ہو گئے۔ شہزادی عالیہ پہلے دروازے کی طرف مُڑی اور کہنے لگی:

"میں ہمیشہ اپنے دل کی تمنّا پُوری نہیں کر سکتی۔ میں دُکھ اُٹھائے بغیر دوسرے لوگوں کے دُکھ کیسے سمجھ سکتی ہوں؟ آج میرے ماں باپ زندہ ہو بھی جائیں، پھر بھی ایک نہ ایک دن مجھے اپنے کندھوں پر حکومت کا بوجھ اُٹھانا ہی پڑے گا۔ اگر میں نے اپنے دل کی تمنّا پوری کی تو اِس طرح میں اپنی رِعایا کے ساتھ بھلائی کرنے کی اہلیّت سے محروم ہو جاؤں گی اور مجھے سوائے اپنی ذات کے اور کسی کا خیال نہیں رہے گا"۔

"شاباش!" دوسرے دروازے کے پیچھے سے آواز آئی "شاباش! میں خوش ہوں کہ تم نے عقل مندی سے کام لیتے ہوئے میرا اِنتخاب کیا ہے۔ شاباش عا------"

"نہیں" شہزادی عالیہ نے دوسرے دروازے کے پیچھے سے آتی ہوئی آواز کو سختی سے ٹوک دیا۔ اِس کے ساتھ ہی اُس کی مُٹھیاں غصّے سے بھینچ گئیں۔ وہ کہنے لگی:

"حکومت طاقت اور قوّت سے نہیں کی جاتی۔ حکومت لوگوں کی خدمت اور بھلائی کا دوسرا نام ہے۔ اور اِس لحاظ سے حکومت خدا کی طرف سے ایک اِنعام ہے۔ میں لوگوں کی خدمت کرنے کی خواہش مند ہُوں، لوگوں سے اپنی خدمت کرانے کی خواہش مند نہیں"۔

یہ کہہ کر وہ تھکے تھکے انداز سے فرش کی طرف جھکی تاکہ وہ شمع اُٹھا لے جو اُس نے نیچے رکھ دی تھی۔ وہ اِتنی دیر دونوں دروازوں کے سامنے کھڑی رہی تھی کہ اُس شمع کو ختم ہو کر بُجھ جانا چاہیے تھا۔ مگر وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گئی کہ وہ شمع جلتے رہنے کے باوجود اب بھی اُتنی ہی لمبی تھی جتنی کہ فرش پر رکھتے وقت تھی۔ وہ شمع اُٹھا کر سیدھی کھڑی ہو گئی اور ایک بار پھر بند دروازوں سے مُخاطِب ہو کر کہنے لگی:

"میں تُم دونوں میں سے کسی کا بھی اِنتخاب نہیں کرتی۔ اچھّا حاکم مُشکلوں کا سامنا اپنی اہلیّت، لیاقت اور قابلیّت سے کرتا ہے۔ مجھے بھی ایسا ہی کرنا چاہیے---- اور میں ایسا ہی کروں گی"۔

وہ مُڑ کر سیڑھیاں اُتری تو اُس کے پیچھے دونوں

دروازوں سے آتی ہوئی مِنّتیں، اِلتجائیں اور چیخیں اُسے آخری زینے تک سُنائی دیتی رہیں۔

وہ بڑے دروازے سے گزر کر راہ داری کی طرف آئی تو اُس نے دیکھا کہ بوڑھا ارسطو دروازے کے پاس کھڑا اُس کا اِنتظار کر رہا ہے۔ اُس نے شہزادی کی طرف ہم دردانہ نظروں سے دیکھا اور پھر اِطمینان کا ایک گہرا سانس لیا۔ زبان سے ایک لفظ کہے بغیر اُس نے شمع شہزادی عالیہ کے ہاتھ سے لے لی اور اُسے واپس شمع دان میں رکھ دیا۔ پھر اُس نے ایک بڑی سی چابی شہزادی کی طرف بڑھا دی۔ اُس نے دیکھتے ہی جان لیا کہ یہ بڑے دروازے کے قُفل کی چابی ہے۔ اُس نے مُڑ کر دروازے کے دونوں پٹ بند کیے اور اُس میں تالا لگا کر چابی دوبارہ بوڑھے ارسطو کی طرف بڑھا دی۔ پھر وہ کہنے لگی:

"میرا خیال ہے، یہ چابی وہیں جانی چاہیے جہاں سے یہ آئی ہے"۔

بوڑھا ارسطو مسکرایا۔ پھر اُس نے جُھک کر آداب بجا لاتے ہوئے کہا "ملکۂ عالیہ، جو آپ کا حکم"

شہزادی عالیہ نے اپنے بوڑھے اُستاد کی زبان سے اپنے لیے "ملکۂ عالیہ" کے الفاظ سُنے تو کچھ حیران سی ہوئی۔ مگر ابھی وہ اُس سے کچھ پُوچھنے نہ پائی تھی کہ اُس نے اُس چابی کو ہَوا میں اُچھال دیا۔ چابی کا ہَوا میں اُچھلنا تھا کہ وہ چابی کی بجائے ایک تاج بن گئی۔ بوڑھے ارسطو نے وہ تاج دونوں ہاتھوں سے سنبھالا اور آہستہ سے شہزادی کے سر پر سجا دیا۔ پھر وہ کہنے لگا:

"کل آپ کی تاج پوشی ہوگی۔ مِلکہ بننے کا حق آپ نے حاصل کر لیا ہے۔ آپ اِمتحان میں کام یاب ہو گئی ہیں"۔

"اور اگر، میں ناکام رہتی تو؟" شہزادی نے تاج کو چُھوتے ہوئے کہا۔

"تو پھر آپ یہاں نہ ہوتیں۔ آپ کی لاش وہاں چبوترے پر پڑی ہوتی۔ وہ دونوں دروازے موت کے دروازے ہیں۔ آپ نے وُہی فیصلہ کیا جو صحیح معنوں میں ایک مِلکہ کو کرنا چاہیے تھا۔ اِن دروازوں سے زندہ واپس وہی آتا ہے جو حکومت کے قابِل ہوتا ہے"۔

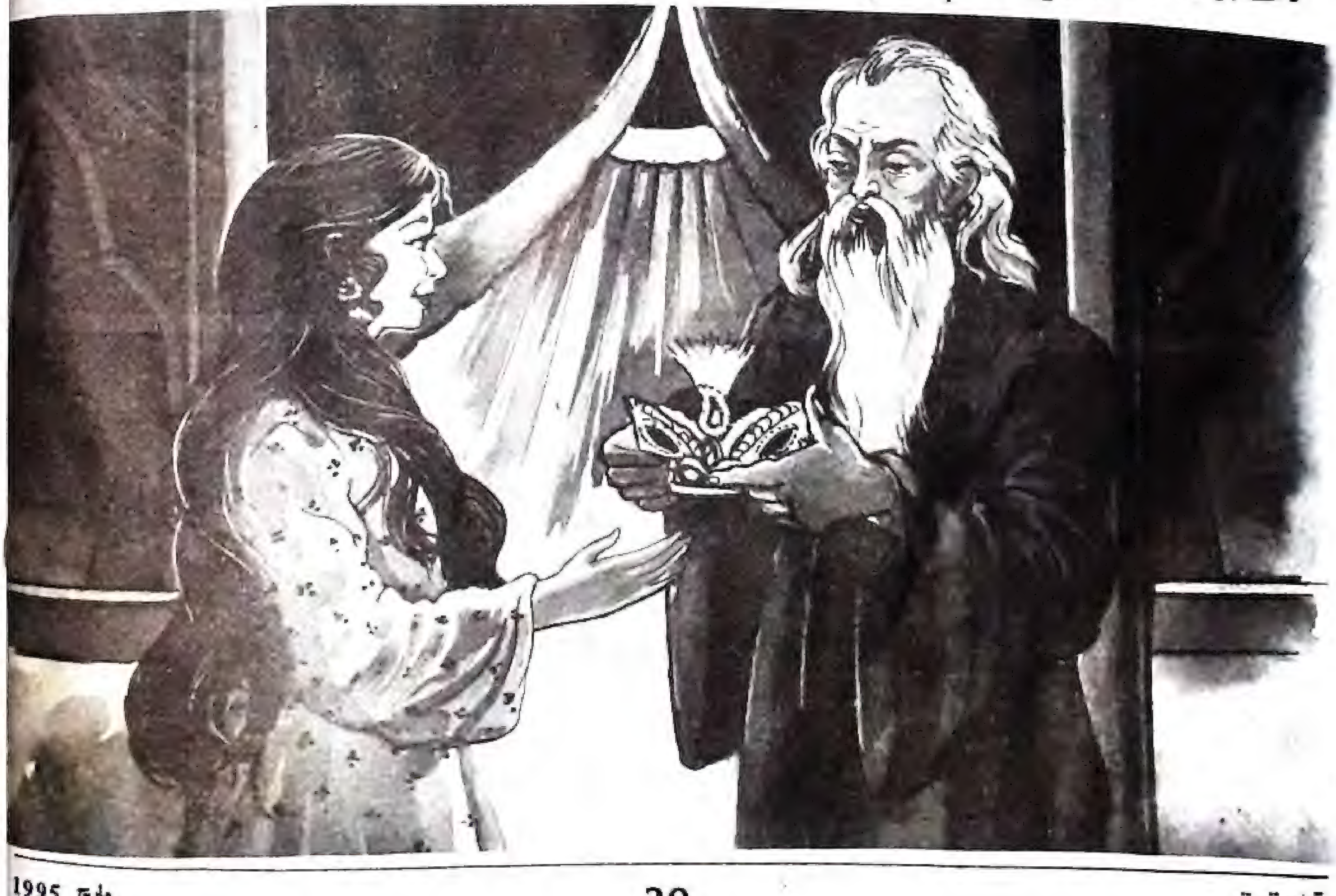

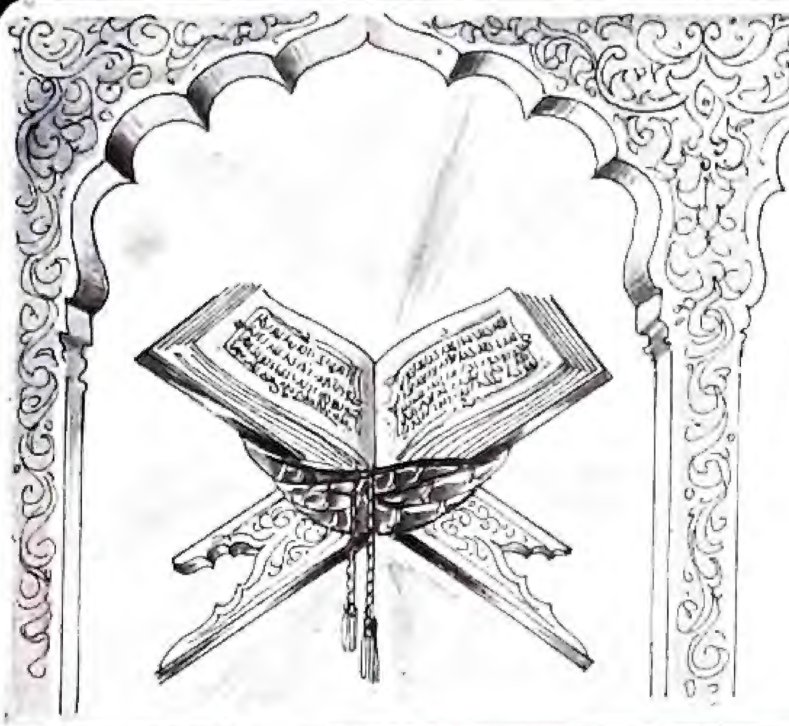

درسِ قرآن

بھلی بات

بچّوں کے لیے درسِ قرآن میں اِس دفعہ ہمارا موضوع ہے : بھلی بات۔ اِس اہم موضوع پر قرآنی روشنی ڈالنے کے لیے ہم نے پہلے پارہ کی دوسری سورت کی آیت نمبر 83 کے اِس جملے کا اِنتخاب کیا ہے :

اَعُوذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیطٰنِ الرَّجِیمِ
بِسمِ اللّٰہِ الرَّحمٰنِ الرَّحِیمِ

قُولُوا لِلنَّاسِ حُسنًا
ترجمہ : لوگوں سے بات عمدگی سے کرو

اسلامی تعلیمات کا ایک بنیادی پہلو روزمرہ بات چیت کی عمدگی ہے۔ تمام مذاہب اور تمام مہذّب نظام بھلی اور عمدہ بات چیت پر زور دیتے ہیں۔ مگر اسلام نے انسانی اخلاق کے اس خوب صورت پہلو پر سب سے زیادہ زور دیا ہے۔ اچھّے اندازِ گفت گو سے انسان کا وقار بڑھتا ہے۔ گندی سندی باتوں سے انسانی عزّت اور مقام کو سخت ٹھیس لگتی ہے۔

زندگی کے ہر شعبے میں ہر لحظہ بھلی اور عمدہ بات چیت ہی کا غلبہ ضروری ہے۔ کس قدر افسوس کی بات ہے کہ ہمارے کئی محترم اِداروں میں بات کی عمدگی کے قرآنی حکم کی کھلّم کھلاّ خلاف ورزی ہوتی ہے۔ تعلیمی اداروں میں تلخ کلامی، اِشتعال انگیزی اور نعرہ بازی کا بھلا کیا مقام ہے؟ بعض مسجدوں میں بعض لوگ ایک دوسرے کے خلاف ناشائستہ زبان استعمال کرتے ہیں۔ قومی اسمبلیوں میں کئی بار ہلڑ بازی اور ہاتھاپائی کی نوبت آجاتی ہے۔

اِن افسوس ناک باتوں سے ہم سب کا وقار مجروح ہوتا ہے۔ اس بات کی اشد ضرورت ہے کہ ہم سب تہیّہ کرلیں کہ ہم کسی وقت بھی اور کہیں بھی ناشائستہ زبان استعمال نہیں کریں گے۔ ہم سب خود بھی بھلی بات کریں گے اور دوسروں کو بھی بھلی بات کرنے کی تلقین کریں گے۔

ڈاکٹر عبدالرؤف

دانائی کی باتیں

ڈاکٹر نصیر احمد ناصر

آدم خور شیر

سنہری چڑیا نے کہا!

پیارے بچو، آج میں آپ کو ایک آدم خور شیر کی کہانی سنانا چاہتی ہوں۔ شیر کو جنگل کا بادشاہ کہا جاتا ہے۔ شکاری کہتے ہیں کہ اس کی آنکھوں میں بلا کی دہشت ہوتی ہے۔ چُناں چہ درختوں پر بیٹھے ہوئے بندروں میں جو بندر اس کی آنکھوں سے آنکھیں ملاتا ہے، وہ مارے دہشت کے اس کے سامنے گر پڑتا ہے، اور شیر اسے کھا جاتا ہے۔

شیر سے جنگل کے سب جانور ڈرتے ہیں۔ لیکن وہ خود جنگلی کتّوں سے ڈرتا ہے۔ جنگلی کتّے ڈار بنا کر جنگل میں شکار کے لِیے نکلتے ہیں اور جو جانور سامنے آئے اسے نوچ نوچ کر ہڑپ کر جاتے ہیں۔ اگر شیر سامنے آجائے تو کتّے اس پر بھی ٹوٹ پڑتے ہیں۔ جنگلی کتّے بھاگتے بھاگتے شکار کرتے اور شکار کی تکّا بوٹی کرتے جاتے ہیں۔

کہتے ہیں کہ شیر عام طور پر آدمی پر حملہ نہیں کرتا۔ لیکن سخت بھوکا ہو تو پھر آدمی پر پیچھے سے حملہ کرتا ہے۔ درندے عموماً اپنے شکار پر سامنے سے نہیں، پیچھے سے حملہ کرتے ہیں۔ شیر اگر ایک دفعہ آدمی کا گوشت کھالے تو اسے اِس کا چسکا پڑ جاتا ہے اور پھر وہ آدم خور بن جاتا ہے، یعنی انسانوں کو کھانا شروع کر دیتا ہے۔

آدم خور شیر انتہائی دلیر اور خطرناک بن جاتا ہے۔ وہ جنگل میں آدمیوں کو ڈھونڈتا پھرتا ہے۔ یہاں تک کہ جنگل میں رہنے والوں کی جھونپڑیوں پر بھی حملہ کرنے سے نہیں چوکتا۔ اگر کسی آدمی کو دیکھ لے تو کسی جھاڑی میں چُھپ جاتا ہے اور اسے دیکھتا رہتا ہے۔ جب وہ آدمی اس جھاڑی کے قریب سے گزرتا ہے تو آدم خور شیر ایک دم جھاڑی میں سے نکل کر اسے دبوچ لیتا ہے۔

کہا جاتا ہے کہ شیر صرف اپنا شکار کیا ہوا جانور کھاتا ہے، مُردار نہیں کھاتا۔ اور نہ دوسروں کا مارا ہوا کھاتا ہے۔

بنگلہ دیش میں ایک بہت بڑا گھنا جنگل ہے۔ اس کا نام سُندر بن ہے۔ اس میں شیر، چیتے، بھیڑیے، ریچھ، ہاتھی اور جنگلی کتّے کثرت سے پائے جاتے ہیں۔ ہر قسم کے شکاری دور دور سے وہاں شکار کے لِیے جاتے ہیں۔ سُندر بن کے باسی ان شکاریوں کی رہ نمائی کرتے ہیں۔ یہ ان کی روزی کا ایک بڑا ذریعہ ہے۔

ہماری کہانی اس زمانے سے تعلُّق رکھتی ہے جب ہندوستان غلام ملک تھا اور اس پر انگریز حکومت کرتے تھے۔ سندر بن کا ایک شیر آدم خور بن گیا تھا اور اس نے جنگل میں اتنی دہشت پھیلا رکھی تھی کہ وہاں کے لوگوں کی زندگی اجیرن ہو گئی تھی۔ اس شیر کا شکار کرنے کے لِیے بڑے بڑے شکاری سندر بن گئے۔ لیکن اس کا شکار کرنے کے بجائے خود اس کا شکار ہو گئے۔

سندر بن میں چھوٹے چھوٹے بہت سے گاؤں ہیں۔ آدم خور شیر رات کو کبھی اِس گاؤں سے کسی آدمی کو دبوچ کر لے جاتا تو کبھی اُس گاؤں سے۔ وہ نہ بچّوں کو چھوڑتا اور نہ عورتوں کو۔ اتنی عیّاری اور چابک دستی سے جھونپڑی میں گھستا کہ اس وقت پتا چلتا جب وہ کسی کو دبوچ کر رات کے اندھیرے میں غائب ہو جاتا۔

اس خوں خوار شیر کی خونی داستانیں سارے ہندوستان میں پھیل گئی تھیں۔ اخبارات میں حکومت سے مُطالبہ کیا جانے لگا کہ وہ اس خوف ناک درندے سے لوگوں کی جان چُھڑائے۔ اس وقت ہندوستان کا وائسرائے لارڈ ویول تھا

اس نے وزیرِ اعظم برطانیہ کو لکھا کہ اِس شیر کو ہلاک کرنے کے لِیے کوئی تجربہ کار شکاری جلد بھجوایئے۔ وزیرِ اعظم نے لارڈ ویول کی درخواست پر ایک مشہور اور تجربہ کار شکاری بھجوا دیا۔

شکاری ہندوستان آیا تو لارڈ ویول نے فوراً اسے سندربن بھجوا دیا۔ سندربن پہنچ کر شکاری نے آدم خور شیر کے متعلِّق تمام ضروری معلومات حاصل کیں۔ یعنی اس کے حملہ کرنے کا طریقہ کیا ہے، جس گاؤں میں کسی آدمی وغیرہ کا شکار کرتا ہے، پھر کب وہاں آتا ہے وغیرہ وغیرہ۔ آخر کار وہ اس گاؤں میں پہنچ گیا جہاں شیر کے دوبارہ حملہ آور ہونے کی توقّع تھی۔

اس نے پہلے گاؤں کے آس پاس کا جائزہ لیا۔ پھر رات کو ایک جگہ بچھڑا باندھ دیا، اور خود ایک جھونپڑی میں سو گیا۔ صبح ہوئی تو اس نے دیکھا کہ شیر اس بچھڑے کو لے گیا ہے۔ شکاری خون کے نشانات کے پیچھے چلتا گیا، یہاں تک کہ ندی کے کنارے پہنچ گیا۔

یہاں آکر شکاری نے دیکھا کہ شیر دوسرے کنارے پر موجود ہے۔ وہ بڑا ہوشیار اور عیّار تھا۔ اس نے بھی شکاری کو دیکھا، لیکن مُنہ دوسری طرف کر لیا، جیسے اس کو دیکھا ہی نہیں۔ وہ شکاری کو دھوکے میں رکھ کر اسے شکار کرنا چاہتا تھا۔ اِدھر شکاری نے بھی ایسا ہی کیا۔ اسے تجربہ تھا کہ شیر اس کے تعاقُب میں ضرور آئے گا۔ اس نے ایک چھوٹا سا غار دیکھا تو اس کے اندر چُھپ گیا، اور شیر کا انتظار کرنے لگا۔ بندوق اس کے کندھے پر لٹکی ہوئی تھی۔ اتفاقاً اس نے غار میں ایک چمکیلی اور خوب صورت چیز دیکھی۔ اس نے اسے اُٹھا لیا اور غور سے دیکھنے لگا۔ اس طرح وہ شیر سے غافل ہو گیا۔ لیکن وہ بھول گیا کہ ایک لمحے کی غفلت بعض اوقات انسان کو ہلاکت میں ڈال دیتی ہے۔

اتنے میں اسے محسوس ہوا کہ غار کے دہانے پر کوئی آیا ہے۔ اُس نے اِحتیاط سے مُنہ موڑ کر غار کے دہانے کی طرف دیکھا تو دم بخود رہ گیا۔ لیکن اپنے اوسان خطا نہ ہونے دیے۔ شیر عادت کے مُطابِق اپنے شکار کو دیکھ کر مسکرانے لگا۔ اِس طرح وہ اسے دہشت زدہ کرنا چاہتا تھا۔ یہ بھی شیروں کا ایک طرح کا کھیل ہوتا ہے۔ بلّی بھی، جسے شیر کی خالہ کہتے ہیں، چوہوں سے پہلے کھیلتی ہے اور پھر ان کو پکڑ کر کھاتی ہے۔ شکاری نے نہ جُنبِش کی اور نہ شیر سے نظریں ہٹائیں۔ وہ بڑی اِحتیاط کے ساتھ آہستہ آہستہ اپنا ہاتھ بندوق کی طرف بڑھانے لگا۔ شیر اور شکاری دونوں ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے کھڑے تھے۔ شیر اپنے انداز میں شکاری کا مذاق اُڑا رہا تھا، اور شکاری بظاہر دم بخود اپنا ہاتھ بندوق کی طرف بڑھا رہا تھا۔ یہ کھیل جاری تھا کہ بندوق شکاری کے قبضے میں آگئی۔ شکاری بڑا تجربہ کار نشانہ باز تھا۔ اس نے آہستہ آہستہ بندوق کی نال شیر کے سر کے سامنے کر دی۔

شیر شکاری کے ساتھ اٹھکیلیاں کر رہا تھا کہ شکاری نے لبلبی دبا دی اور گولی سیدھی شیر کی کھوپڑی پر لگی۔ وہ پاش پاش ہو گئی۔ لیکن اس کے باوجود وہ غصّے میں آکر شکاری پر جھپٹنے ہی والا تھا کہ شکاری نے انتہائی پُھرتی کے ساتھ دوسری گولی چلا دی، جو سیدھی اس کے سینے پر لگی۔ وہ دھڑام سے گرا، تھوڑی دیر غُرایا، تڑپا اور پھر ہمیشہ کے لِیے ٹھنڈا ہو گیا۔

شکاری نے اپنی آپ بیتی میں لکھا ہے "شیر کو مار کر میں نے آئینہ دیکھا تو میرے سیاہ بال خوف کی وجہ سے سفید ہو گئے تھے"۔

آدم خور شیر کے ہلاک ہونے کی خبر سُن کر جنگل کے باسیوں نے جشن منایا۔ ملک کے اخباروں نے شکاری کی تعریف میں اداریے لکھے، اور حکومت نے اسے اِنعام و اِکرام سے نوازا۔

عیدُالفطر

اِس مہینے کی تین یا چار تاریخ کو عیدُ الفطر ہے۔ مسلمان یہ عید رَمضان کے روزے پورے ہونے کی خوشی میں مناتے ہیں۔ اِس روز آپ کو چاہیۓ کہ صبح سویرے اُٹھ کر غُسل کریں۔ نئے کپڑے پہنیں اور نماز پڑھنے جامع مسجد یا عید گاہ جائیں۔ عید گاہ جانے سے پہلے کھجوریں یا کوئی میٹھی چیز کھانا اچھا ہے۔

اِس دن مسلمان خدا کی راہ میں صدقۂ فِطر دیتے ہیں۔ صدقہ دینا ہر اُس مسلمان پر لازم ہے جس کے پاس ساڑھے باون تولے چاندی یا ساڑھے سات تولے سونا ہو۔ ایسے شخص کو چاہیۓ کہ وہ گھر کے ہر فرد کے بدلے دو سیر گیہوں یا اُن کی قیمت کسی غریب آدمی کو دے۔ صدقۂ فطر نمازِ عید سے پہلے دینا بہتر ہے۔ لیکن نماز کے بعد بھی دیا جا سکتا ہے۔

جب آپ عید گاہ جائیں تو راستے میں بلند آواز سے یہ تکبیر پڑھیں: اَللّٰہُ اَکبَر اَللّٰہُ اَکبَر لا اِلٰہَ اِلاّ اللّٰہُ وَاللّٰہُ اَکبَر اَللّٰہُ اَکبَر وَلِلّٰہِ الحَمد (اللہ بہت بڑا ہے۔ اللہ کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں اور اللہ بہت بڑا ہے، اللہ بہت بڑا ہے اور اللہ ہی کے لیے سب تعریفیں ہیں)۔

عید گاہ یا جامع مسجد پہنچ کر جہاں جگہ ملے، بیٹھ جائیں اور جب نماز شروع ہو تو یہ نیّت کریں "میں دو رکعت عید کی واجب نماز، چھ تکبیروں کے ساتھ پڑھتا ہوں"۔ پھر امام کے ساتھ اللّٰہُ اکبر کہہ کر ہاتھ باندھ لیجیے اور سُبحٰنَکَ اللّٰھُمَّ پڑھیے۔ اِس کے بعد خاموش ہو جائیے۔ جب امام تکبیر کہے تو آپ بھی تکبیر کہیۓ۔ پہلی تکبیر کے ساتھ کانوں تک دونوں ہاتھ اُٹھا کر اللّٰہُ اکبر کہیۓ اور ہاتھ چھوڑ دیجیۓ۔ پھر ہاتھ اٹھا کر اللہ اکبر کہیۓ اور ہاتھ چھوڑ دیجیے۔ اِس کے بعد ہاتھ اُٹھا کر اللّٰہُ اکبر کہیۓ اور ہاتھ باندھ لیجیے۔ اب امام صاحب اَلحَمد اور کوئی سورت پڑھ کر رکوع اور سجدہ کریں گے۔ آپ بھی اُن کے ساتھ رکوع اور سجدہ کیجیے۔

دوسری رکعت میں امام صاحب الحمد اور سورت پڑھیں گے اور تکبیر کہیں گے۔ پہلی تکبیر میں آپ، امام صاحب کے ساتھ، ہاتھ اُٹھا کر چھوڑ دیجیے۔ دوسری اور تیسری تکبیر میں بھی ایسا ہی کیجیے۔ لیکن چوتھی تکبیر کے ساتھ، بغیر ہاتھ اُٹھائے، اللّٰہ اکبر کہہ کر رکوع میں چلے جائیے اور نماز پوری کیجیے۔

نماز کے بعد اِمام صاحب دو خطبے پڑھیں گے، جن کا سُننا اُتنا ہی ضروری ہے جتنا نماز پڑھنا۔ اِس لیے اُنھیں نہایت خاموشی اور اِطمینان سے سُنیے۔ خُطبے کے بعد اُس راستے سے گھر واپس نہ جائیے جس راستے سے آئے تھے۔ کوئی دوسرا راستہ اِختیار کیجیے۔ ایسا کرنا سُنّت ہے۔

نماز پڑھ کر دوستوں اور عزیزوں کو عید کی مبارک باد دینا اور گلے ملنا بھی سُنّت ہے۔ خوشی منانا، میلے میں جانا اور دوستوں کو عید کارڈ بھیجنا اچھا ہے۔ لیکن اِن کاموں میں فضول خرچی نہیں کرنا چاہیۓ۔

****

خطرناک منصوبہ

سلیم خان گمی

کشمیری مُجاہد، خالد، منی مرگ کے راستے سے بلتستان کے صدر مقام سکردو آیا تھا اور اب سیٹلائیٹ ٹاؤن کے ایک بنگلے کی بیٹھک میں میجر توصیف کے سامنے کرسی پر بیٹھا تھا۔ اُس نے تین دن اور تین راتیں سفر کیا تھا اور اب تھکاوٹ اور نیند سے اُس کے جسم کا ایک ایک عضو آرام کا مُطالبہ کر رہا تھا۔ لیکن وہ مجاہد ہی کیا جو جسم کا مُطالبہ آسانی سے مان لے۔ اُس کی تو روحانی قوّت اِتنی طاقت ور ہوتی ہے کہ ذہن جسم پر فتح پالیتا ہے۔

میجر توصیف نے میٹھے دودھ کا گلاس خالد کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا "میں تو آپ کی بات سُن کر حیران رہ گیا ہوں! مجھے اپنے کانوں پر یقین نہیں آ رہا!"۔

"آپ یقین کریں یا نہ کریں، آپ کے کان میری بات پر بھروسا کریں یا نہ کریں، حقیقت، حقیقت ہی رہے گی" خالد نے کہا اور دودھ کا گھونٹ بھرا۔ دودھ گرم اور خالص تھا۔ اُسے مزہ آیا۔

"دیسی مُرغ، دیسی گھی میں، آپ کے لیے بُھونا جا رہا ہے۔ دودھ پی لیجیے۔ آدھ گھنٹے میں کھانا تیار ملے گا" میجر نے کہا۔

"میں مرغ کھانے کے لیے منی مرگ کے خطرناک راستے سے یہاں حاضر نہیں ہوا۔ میں تو یہ اِطّلاع دینے آیا ہوں کہ بھارت کا ایک پروفیسر کرپارام ایک یہودی پروفیسر جود کی مدد سے ایسی زہریلی چمگادڑیں تیار کر رہا ہے جو کشمیر کے لوگوں پر چھوڑ دی جائیں گی۔ وہ اُن کے کاٹیں گی تو اُن کے زہر سے ہزاروں لوگ ہلاک ہو جائیں گے"۔ خالد نے کہا۔

"مجھے اِس بات پر یقین نہیں آ رہا"۔ میجر توصیف کی حیرت ابھی تک قائم تھی۔

"یہ سائنس کا زمانہ ہے، سر۔ پہلے کبھی کسی نے سُنا تھا کہ دُھند سے اِنسان مرجاتا ہے؟ اب زہریلی گیس دُھند کی طرح پھیلتی ہے اور ہزاروں لوگ موت کی وادی میں سو جاتے ہیں۔ پہلے کبھی کسی نے سوچا تھا کہ ایٹم کا ذرا سا ذرّہ ایک بھرا پُرا شہر تباہ کر سکتا ہے؟ لیکن جاپان کے شہروں ہیروشیما اور ناگاساکی میں دوسری بڑی جنگ کے دوران میں کیا ہُوا؟ ٹینک یا جہاز کئی میل دور ہوتا ہے اور توپ کا گولا سیدھا اُس پر آ گرتا ہے۔ بھلا کیوں؟ یہ سائنس کا کمال ہے، سر۔ یہ جینی اِنجینئرنگ کا زمانہ ہے۔ چمگادڑوں کو سانپ کی طرح کیوں اِستعمال نہیں کیا جا سکتا؟" خالد کسی وکیل کی

طرح بول رہا تھا۔
"میں آپ کی باتیں سُن رہا ہوں اور مان رہا ہوں۔ لیکن چمگادڑ والی بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔ خیر' کوئی بات نہیں۔ میں ابھی پتا کرتا ہوں۔ آپ دودھ پئیں"۔
یہ کہ کر میجر توصیف نے فون کا ریسیور اُٹھا کر ایک نمبر گھمایا۔ جب دوسری طرف سے کسی نے ریسیور اُٹھایا تو میجر توصیف نے سوال کیا "کیا زوآلوجی کے پروفیسر نذیر قریشی گھر پر ہیں؟ میں میجر توصیف اِنچارج فیلڈ انٹیلی جنس یُونٹ بول رہا ہوں"۔
"کہیۓ' میجر صاحِب؟ کیا بات ہے؟ کیوں یاد کیا؟ میں بول رہا ہوں' پروفیسر نذیر قریشی"۔
"پروفیسر صاحِب' کاٹ کھانے والی چمگادڑ کے مُتعلّق پُوچھنا تھا۔ یعنی وہ جو اِنسان کا خون چُوستی ہے"۔
دوسری طرف سے پروفیسر نے کہا "عام چمگادڑیں پھل کھاتی ہیں' مثلاً امرود وغیرہ۔ پھل کے علاوہ وہ کیڑے مکوڑے بھی کھاتی ہیں۔ لیکن اِن کی ایک قسم ایسی ہے جو جان داروں کا خون پیتی ہے۔ ویسے چمگادڑوں کی تقریباً ایک ہزار قِسمیں ہیں"۔
"کیا چمگادڑوں کو شکاری پرندوں کی طرح سَدھایا جا سکتا ہے؟ یعنی ہم اُن سے یہ بات کہ سکتے ہیں کہ وہ آدمیوں پر حملہ کریں اور اُن کا خون چُوسیں؟"
"پہلی بات تو یہ ہے کہ چمگادڑ پرندہ نہیں ہے' ممِمل یعنی دودھ پلانے والا جانور ہے۔ وہ انڈے نہیں دیتی' بچّے دیتی ہے اور اُنھیں اپنا دودھ پلاتی ہے۔ ہاں' اُسے دوسرے جانوروں کی طرح سَدھایا جا سکتا ہے" زوآلوجی یعنی حیوانات کے پروفیسر نے کہا۔
"شکریہ' بہُت بہُت شکریہ' پروفیسر صاحِب" میجر نے کہا اور فون بند کر دیا۔
خالد دودھ پی چکا تھا اور میجر کو گھور رہا تھا۔ اُس کی آنکھوں میں چمک تھی۔ "کیا کہا پروفیسر نے؟" اُس نے سوال کیا۔
"چمگادڑ پرندہ نہیں' ممِمل ہے اور اسے سَدھایا جا سکتا ہے" میجر بولا۔
"گویا میری اِطّلاع دُرست نکلی" خالد خوش ہو کر بولا۔
"جی ہاں۔ آپ کی اِطّلاع دُرست ہے۔ آپ کا بہُت بہُت شکریہ" میجر نے کہا اور سوچنے لگا۔
"میری اِطّلاع کے مُطابِق بھارتی سائنس دان 500 زہریلی چمگادڑیں سدھا رہے ہیں۔ اُن کا اِنچارج مائکرو بیالوجی کا پروفیسر کرپارام ہے جو بھارت کے ایک شہر بنارس کا رہنے والا ہے۔ اُس کی مدد کے لیے اُس کی بیٹی کوشلیا اُس کے ساتھ ہے۔ وہ اُس کی ایک طرح سے سیکرٹری ہے۔ پروفیسر کرپا رام کے ساتھ ایک یہودی پروفیسر بھی ہے جس کا نام جود ہے۔ وہ بھی بیالوجی کا پروفیسر ہے اور بھارتی حکومت نے پروفیسر کرپارام کی مدد کے لیے اُسے اِسرائیل سے بُلوایا ہے۔ جس جگہ چمگادڑیں پالی جا رہی ہیں' وہ ایک پُرانا مندر ہے اور اُس کا نام ہے پاندرتھان۔ یہ مندر مقبوضہ کشمیر میں ہے۔ اِس پر سیکورٹی کا سخت پہرا ہے اور سیکورٹی کا اِنچارج بریگیڈیئر تھاپا ہے جو بھارتی صوبہ آسام کا رہنے والا ہے۔ یہ لیجیے پاندرتھان کا نقشہ اور دوسری معلومات' اور مجھے اجازت دیجیے۔ میں واپس جاؤں گا"۔ یہ کہ کر خالد نے کاغذات کا پُلندہ میجر توصیف کے سامنے رکھ دیا۔
"شکریہ۔ لیکن پہلے آپ کھانا کھائیں گے' پھر آج کا دن اور رات آرام کریں گے اور کل صبح سویرے آپ کو بلتستان اور مقبوضہ کشمیر کی سرحد پر چھوڑ دیا جائے گا" میجر بولا۔
خالد میجر کے پیچھے پیچھے چل دیا۔ دونوں کمرے سے باہر نکل گئے۔
اگلے دن صبح کو خالد مقبوضہ کشمیر روانہ ہوا تو میجر توصیف نے پوچھا "ہم آپ کی کیا مدد کر سکتے ہیں؟"
"ہماری مدد اللہ تعالیٰ کر رہا ہے اور ہمیں اُمّید ہے

آیندہ بھی وہ ہماری مدد فرمائے گا۔ ہم گولی سکّے کا مقابلہ اپنے حوصلے سے کرتے ہیں اور کرتے رہیں گے۔ بھارتی فوج ہمارے دس آدمی مارتی ہے تو ہم بھی اُس کے پانچ فوجی ہلاک کرتے ہیں۔ لیکن زہریلی چمگادڑوں کے حملے کا توڑ ہمارے پاس نہیں ہے۔ ہم مجاہد ہیں، سائنس دان نہیں ہیں اور وہ بھی ایسی سائنس جسے جینی (Genetic) اِنجینئرنگ کہا جاتا ہے" خالد نے کہا۔

"میں بھی فوجی ہوں، سائنس دان نہیں ہوں۔ میں کوشش کروں گا کہ زہریلی چمگادڑوں کے مُتعلّق اعلیٰ افسروں کو آگاہ کردوں" توصیف نے تسلّی دیتے ہوئے کہا۔

"میں چاہتا ہوں آپ کے اعلیٰ افسروں کو جلد از جلد پتا چل جائے کہ بھارت مقبوضہ کشمیر کے نہتّے اور معصوم لوگوں کو تباہ کرنے پر تُلا ہوا ہے اور اس غرض کے لیے وہ ہر فوجی اور سائنسی حربہ اِستعمال کر رہا ہے" خالد فِکر مند ہو کر بولا۔

"میں آپ کی پریشانی میں برابر کا شریک ہوں، خالد بھائی" میجر توصیف نے کہا۔ اِس کے بعد دونوں گلے ملے اور خالد رُخصت ہوگیا۔

میجر توصیف نے کنٹرول سے وائرلیس پر بات کی اور پھر خالد کے دیے ہوئے تمام کاغذات اور نقشے ایک خاص قاصد کے ذریعے کنٹرول کے ہیڈ کوارٹر بھیج دیے۔ کنٹرول کا عُہدہ بریگیڈیئر کا تھا اور وہ سائنس کے اُس شعبے کا اِنچارج تھا جسے سائنسی معلومات کی لیبارٹری کا نام دیا گیا تھا۔

دو ہفتے بعد میجر توصیف کو اِطّلاع ملی کہ اگلے دن صبح کی فلائٹ پر دو مہمان سکردو ایئرپورٹ پر اُتریں گے۔ وہ اُن کا اِستقبال کرے اور وہ جو ہدایات دیں، اُن پر پورا پورا عمل کرے۔ مرد مہمان جرمن ہے اور اُس کا عُہدہ بریگیڈیئر کا ہے، خاتون مہمان کشمیری ہے اور اُس کا عُہدہ میجر کا ہے۔ دونوں سائنس دان ہیں۔ اُن دونوں کے ہاتھ میں سُرخ رنگ کی چھتریاں ہوں گی۔ یہ اُن کی پہچان ہے۔

اگلے دن صبح دونوں مہمان آگئے۔ مرد مہمان کا نام پروفیسر ڈاکٹر ہیلمٹ کنکل تھا۔ اُس کے پاس جرمنی کی برلن یونی ورسٹی کی جینی اِنجینئرنگ کی ڈگری تھی۔ خاتون کا نام حبّہ خانم تھا۔ اُس کی مادری زبان کشمیری تھی لیکن وہ اُردو، گوجری، پنجابی، ڈوگری، ہندی، انگریزی اور سنسکرت زبانیں بھی جانتی تھی۔ وہ پروفیسر ہیلمٹ کی سیکرٹری تھی۔ یہ دونوں امریکا کے شہری تھے اور اِن کے پاس امریکی پاس پورٹ تھے۔ حکومتِ پاکستان نے خُفیہ طور پر اِن کی خدمات حاصل کی تھیں تاکہ بھارت کا زہریلی چمگادڑوں کا منصوبہ ناکام بنایا جا سکے۔ میجر توصیف نے اپنے دفتر کے دو کمرے اُن کے لیے وقف کر دیے تھے اور اُن کے کھانے پینے اور سونے کا اِنتظام بھی وہیں تھا۔

"یہ ایک نہایت خطرناک منصوبہ ہے" پروفیسر ہیلمٹ

کنکل نے میجر توصیف کے کمرے میں گرما گرم کافی کا گھونٹ حلق سے اُتار کر کہا "اور غالباً بھارت نے یہ منصوبہ اِسرائیلیوں سے لیا ہے"۔

"سر، ہم کو کیا کرنا ہوگا؟" توصیف نے پوچھا۔

"آپ کا سوال بہت سادہ ہے، اِس لیے اِس کا جواب بھی بہت سادہ ہے۔ ہمیں اِس منصوبے کو ناکام بنانے کے لیے ایسا منصوبہ بنانا ہوگا جو اِس منصوبے کو کھا جائے" پروفیسر ہیلمٹ نے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

"یہ منصوبہ کون بنائے گا اور کب؟" میجر توصیف نے جلدی سے پوچھا۔

"یہ منصوبہ میں، آپ، حبّہ خانم اور ایک پاگل کتّا مل کر بنائیں گے" پروفیسر ڈاکٹر ہیلمٹ نے بڑے اِطمینان سے کہا۔

"پاگل کتّا، سر؟" توصیف نے سوال کیا۔

"سکردو میں کتّے عام ملتے ہیں۔ ہمیں صرف ایک کتّا چاہیئے۔ اُسے ٹیکا لگا کر پاگل بنانا منٹوں کا کام ہے" پروفیسر نے کہا۔

"مُعاف کرنا، سر" یہ کہہ کر میجر توصیف کمرے سے باہر نکلا اور کپتان سے کہا کہ وہ کہیں سے آوارہ کتّا پکڑ کر لائے۔

کپتان کو ہدایت دے کر میجر توصیف واپس کمرے میں آیا اور بولا "میں نے کتّا لانے کے لیے کیپٹن کو بھیجا ہے"۔

"شاباش! کتّا آجائے تو سمجھو ہمارا آدھا منصوبہ مکمّل ہوگیا" پروفیسر ہیلمٹ نے کافی ختم کرکے لمبی لمبی مونچھوں پر ہاتھ پھیرا اور بولے "کافی مزے دار تھی۔ اور ہاں، دوپہر کے کھانے میں مَیں ٹراؤٹ مچھلی کا شوربا اور چپاتیاں کھاؤں گا اور رات کو صرف سلاد یعنی گاجریں۔ اور وہ میں اپنے ساتھ لایا ہوں۔ حبّہ خانم بھی کھانے دانے کی شوقین نہیں۔ پھر بھی اِسے چکن دِکن کھلاؤ" پروفیسر نے کہا اور حبّہ خانم کی طرف دیکھا جو دونوں ہاتھوں میں چائے کی پیالی تھامے بریگیڈیئر کو گھور رہی تھی۔

"میں چکن خود پکاؤں گی" حبّہ خانم نے مسکرا کر کہا۔

"تھینک گاڈ۔ میں ڈر رہا تھا کہ حبّہ یہ نہ کہہ دے کہ میں دال کھاؤں گی اور دال ساتھ لے کر آئی ہوں" پروفیسر نے کہا اور تینوں ہنسنے لگے۔

جب میجر توصیف کے مہمان کھانا کھا کر فارغ ہوئے تو کپتان نے اِطلاع دی کہ کتّا آگیا ہے اور صوبے دار مجید اُسے لیے باہر کھڑا ہے۔

"کتّے کو بنگلے کے برآمدے میں لے جاؤ۔ میں اُس کے ٹیکا لگاؤں گا" پروفیسر ہیلمٹ نے کہا اور اُٹھ کر اپنے کمرے میں چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ واپس آیا تو اُس کے ہاتھ میں سرنج تھی جس میں کوئی مائع چیز بھری ہوئی تھی۔ برآمدے میں جا کر اُس نے کپتان اور صوبے دار سے کہا کہ کتّے کو پکڑ کر رکھیں۔ اِس کے بعد اُس نے کتّے کی گردن میں ٹیکا لگایا۔ کتّا تھوڑی دیر بعد گر کر بے ہوش ہوگیا۔

"یہ بے ہوش نہیں ہوا، سوگیا ہے"۔ پروفیسر ہیلمٹ بولا اور حبّہ خانم کو اشارہ کیا۔ حبّہ خانم ایک دوسری سرنج سے کتّے کے جسم سے خون نکالنے لگی۔ اُس نے سرنج کے ذریعے کتّے کے جسم سے خون نکال کر ایک چھوٹی سی شیشی بھرلی۔ یہ خون اصل میں سیرم تھا یعنی خوناب۔

"شاباش! بس اب ہمارا منصوبہ تیّار ہے" پروفیسر ہیلمٹ بولا۔

"ہماری یہ دوا آٹھ گھنٹے تک چمگادڑوں کو سُلا دے گی اور جب وہ سو کر اُٹھیں گی تو پاگل ہو کر اپنے پالنے والوں پر حملہ کر دیں گی۔ اور پھر دیواروں سے سر ٹکرا ٹکرا کر مر جائیں گی"۔

اگلے دن پروفیسر، حبّہ خانم اور میجر توصیف جیپ کے ذریعے منی مرگ روانہ ہوئے۔ یہ عِلاقہ بلتستان میں چھوٹا

کشمیر کہلاتا ہے۔ یہاں کشمیر کے سے درخت، ندی نالے اور چرند پرند ہیں۔ اُسی شام وہ منی برگ پہنچ گئے۔ توصیف اگلے دن واپس آگیا اور پروفیسر ہیلمٹ اور حبہ ایک گائیڈ کے ساتھ سری نگر روانہ ہوگئے۔ وہ امریکی پاس پورٹ پر سفر کر رہے تھے اور اُنھوں نے سیاحوں کا بھیس بدل رکھا تھا۔ وہ سری نگر پہنچے تو خالد اُن کا اِنتظار کر رہا تھا۔ اُسے اُن کی آمد کی اِطّلاع پہلے ہی مل چکی تھی۔

"پاندرتھان کے مندر کے متعلق مجھے زیادہ علم نہیں" پروفیسر ہیلمٹ نے خالد سے کہا۔

"یہ مارتنڈ مندر کی طرح ایک مندر ہے اور سری نگر کے بالکل قریب ہے۔ یہیں 500 چمگادڑوں پر تجربے ہو رہے ہیں۔ یہ تجربے پروفیسر کرپارام اور اُس کی بیٹی کوشلیا کرتے ہیں۔ یہودی پروفیسر جود اُن کی مدد کرتا ہے۔ وہ اِسرائیل سے آیا ہے" خالد نے بتایا۔

"یہودی پروفیسر کا پورا نام کیا ہے؟" پروفیسر ہیلمٹ نے پوچھا۔

"معلوم نہیں۔ اُسے پروفیسر جود ہی کہتے ہیں۔ ویسے اُس کا ٹیلیفون نمبر میرے پاس ہے" خالد نے کہا۔

پروفیسر نے نمبر لے کر پروفیسر جود کو ٹیلیفون کیا۔ دوسری طرف سے آواز آئی۔ "پروفیسر جود"۔

"کون جود؟ ہربرٹ جود یا پیریز جود؟" پروفیسر ہیلمٹ نے پوچھا۔

"پروفیسر پیریز جود" آواز آئی۔

"وہ جو 1965ء میں امریکا کی ہارورڈ یُونی ورسٹی سے بیالوجی میں پی ایچ ڈی کر رہے تھے؟"۔

"جی ہاں، وُہی"۔

"تو پھر میں ہُوں آپ کا ہم جماعت ہیلمٹ کنکل برلن والا"۔

"پروفیسر ہیلمٹ کنکل، آپ تو امریکا میں تھے؟"

"میں اب بھی وہیں ہوں۔ سری نگر آپ سے ملنے آیا ہوں، اپنی سیکرٹری کے ساتھ"۔

"تو کل آجائیے۔ کل اِتوار ہے۔ دوپہر کا کھانا میرے ساتھ کھائیے اور سیکرٹری کو بھی ساتھ لائیے۔ گپ شپ رہے گی" جود نے کہا۔

دوسرے دن پروفیسر ہیلمٹ، حبّہ خانم اور خالد پاندرتھان پہنچے تو پروفیسر جود، پروفیسر کرپارام اور کوشلیا اُن کا انتظار کر رہے تھے۔

پاندرتھان کے اردگرد سخت پہرا تھا۔ بریگیڈیئر تھاپا جو سیکورٹی اِنچارج تھا، دہلی گیا ہوا تھا۔ ویسے بھی چھٹی کا دن تھا۔ اِس لیے اُن سے زیادہ پُوچھ گچھ نہ ہوئی۔ ایک یہ بات بھی تھی کہ وہ پروفیسر پیریز جود کے مہمان تھے۔ کوشلیا اور حبّہ تو فوراً سہیلیاں بن گئیں۔ پروفیسر ہیلمٹ، پروفیسر پیریز جود اور پروفیسر کرپارام باتیں کرنے لگے۔ خالد اِدھر اُدھر گھومنے لگا، اور آخر کار وہ کمرے دیکھنے میں کام یاب ہو گیا جہاں زہریلی چمگادڑیں پَل رہی تھیں۔ اُن میں مصنوعی درخت لگے ہوئے تھے جن کی شاخوں سے کالی کالی بدصورت اور بدبودار چمگادڑیں لٹکی ہوئی تھیں۔ وہ بہت بدمزہ ہُوا اور واپس آگیا۔

"کیا تجربہ ہو رہا ہے؟" پروفیسر ڈاکٹر ہیلمٹ نے پروفیسر کرپارام سے پوچھا۔

"ہم دو قسم کے تجربے کر رہے ہیں۔ ایک یہ کہ کیا عام چمگادڑ ویمپائر یعنی اِنسان کا خون پینے والی چمگادڑ بن سکتی ہے۔ اور دوسرا تجربہ یہ ہے کہ کیا انسانی خون چوسنے والی چمگادڑ جینی انجینئرنگ کے اُصول کے تحت عام چمگادڑ یعنی کیڑے مکوڑے اور پھل کھانے والی بن سکتی ہے" پروفیسر کرپارام نے کہا۔

"کتنے فی صد کام یابی ہوئی ہے؟" ہیلمٹ نے پوچھا۔

"100 فی صد کام یابی کی اُمّید ہے۔ لیکن مُشکل یہ ہے کہ چمگادڑیں شور بہت مچاتی ہیں" پروفیسر کرپارام بولا۔

"مجھے ایسی دوا کا فارمولا معلوم ہے، جس سے کسی بھی جان دار کی آواز بند کی جا سکتی ہے" پروفیسر ہیلمٹ نے کہا۔

"کیا وہ فارمولا آپ ہمیں بتائیں گے؟" پروفیسر کرپارام نے پوچھا۔

"اِتّفاق سے میرے بریف کیس میں اِس دوا کی ایک شیشی پڑی ہے۔ اِسے اپنی لیبارٹری میں چیک کرلیں" پروفیسر ہیلمٹ نے بریف کیس سے خون بھری شیشی نکال کر پروفیسر کرپارام کو تھما دی۔ وہ اُٹھا اور لیبارٹری کی طرف چل دیا۔

"میں دس ماہ سے پروفیسر کرپارام کے ساتھ ہوں اور کل واپس اپنے وطن جا رہا ہوں۔ آپ سے مِل کر مجھے یقیناً بہت خوشی ہوئی ہے" پروفیسر جود نے ہیلمٹ سے کہا۔

"مجھے بھی آپ سے مِل کر بہت خوشی ہوئی" پروفیسر ہیلمٹ کنکل نے کہا۔

پروفیسر کرپارام واپس آیا تو اُس کے ہاتھ میں خون کی وُہی شیشی تھی۔ اُس نے کہا "میں نے اِسے چیک کیا ہے۔ یقیناً اِس سے ہم فائدہ اُٹھا سکتے ہیں"۔

"یہ دوا ایک ہزار چمگادڑوں کے لیے کافی ہے اور اِس کا اثر چھ مہینے تک رہے گا"۔

"شکریہ آپ کا" پروفیسر کرپارام بولا۔

اِس کے بعد اُنھوں نے چائے پی اور پھر ہیلمٹ، حبّہ خانم اور خالد سری نگر آگئے۔ یہاں سے پروفیسر ہیلمٹ اور حبّہ خانم واپس منی مرگ چلے گئے۔

جب صبح وہ منی مرگ میں اپنے میزبان خواجہ مقصود سے سکردُو جانے کے لیے اِجازت طلب کر رہے تھے تو فیکس پر خالد کی طرف سے خواجہ مقصود کے نام یہ پیغام آیا:

"پروفیسر ہیلمٹ کو بتا دیجیے کہ آدھی رات کو چمگادڑوں نے کمروں کے روشن دانوں سے نکل کر دونوں پروفیسروں، کوشلیا اور دو سو بھارتی فوجیوں کو کاٹا اور وہ سب پاگل ہو کر مرگئے۔ چمگادڑیں بھی دیواروں اور درختوں سے سر ٹکرا ٹکرا کر مرگئیں"۔

"مجھے افسوس ہے کہ بُرے باپ کی اچھی بیٹی کوشلیا بھی مرگئی۔ وہ میری سہیلی بن گئی تھی" حبّہ خانم نے سرہلا کر کہا۔

کیا، کیوں، کیسے

سُورج کب مرے گا؟

کائنات کے دوسرے سِتاروں کی طرح، ہمارے سورج کا اِیندھن بھی ایک دن ختم ہو جائے گا اور وہ مرجائے گا۔ لیکن ایسا آج سے 5 یا 6 ارب سال بعد ہو گا۔ اُس وقت سورج میں ہائیڈروجن گیس ختم ہو جائے گی۔ یہی گیس سورج کی بھٹّی میں جلتی ہے، جس سے حرارت اور روشنی پیدا ہوتی ہے۔

جب ہائیڈروجن گیس ختم ہو گی تو سورج سُکڑ جائے گا، ہائیڈروجن کی جگہ ہیلیئم گیس جلانا شروع کر دے گا، اور دہکتا ہُوا سُرخ گولا بن جائے گا۔ اُس وقت وہ ہماری زمین کو نگل لے گا اور زمین پر موجود ہر چیز جل بُھن کر راکھ ہو جائے گی۔

یہ صورتِ حال چند لاکھ سال تک رہے گی۔ اِس کے بعد سورج اور سُکڑے گا اور اُس کا سائز ہماری زمین کے برابر ہو جائے گا۔ اُس کا رنگ بھی سُرخ سے سفید ہو جائے گا۔ آہستہ آہستہ اُس کی حرارت کم ہوتی جائے گی، اور پھر ایک دن وہ بالکل مُردہ ہو جائے گا۔

اُلّو کیا کھاتا ہے؟

اُلّو شکاری پرندہ ہے، اور عام طور پر رات کو شکار کرتا ہے۔ چھوٹے چھوٹے جانور مثلاً چوہے، گلہریاں اور پرندے کھاتا ہے۔ لیکن انہیں چباتا نہیں، کھال اور ہڈیوں سمیت سمُوچا نگل جاتا ہے۔ شکار کا گوشت اُس کے معدے میں ہضم ہو جاتا ہے اور کھال اور ہڈیاں جنہیں معدہ ہضم نہیں کر سکتا، آپس میں مل کر خشک گولی سی بن جاتی ہیں۔ انہیں اُلّو اگل دیتا ہے۔ اِس گولی کو دیکھ کر یہ معلوم کیا جا سکتا ہے کہ الّو نے کیا کھایا تھا۔ اگر آپ کو کسی درخت کے نیچے اِس طرح کی کوئی گولی ملے تو سمجھ جائیے کہ اِس درخت کی کھوہ میں اُلّو رہتا ہے۔

اُلّو کی بہت سی قِسمیں ہیں۔ اِس کی ایک قِسم مچھلیاں اور مینڈک کھاتی ہے۔ ایشیا کے لوگ اِسے منحوس اور بے وقوف سمجھتے ہیں۔ یورپ کے لوگوں کے نزدیک یہ بہت عقل مند پرندہ ہے۔ دونوں باتیں ہی غلط ہیں۔

بِلّی کی زبان کھُردُری کیوں ہوتی ہے؟

بِلّی زبان نکالے تو اُسے غور سے دیکھیے۔ وہ کھُردُری سی معلوم ہو گی۔ قُدرت نے اُس کی زبان کھُردری اِس لیے بنائی ہے کہ وہ ہڈّی پر لگا ہُوا گوشت کھُرچ کر کھا سکے۔ اِس کے عِلاوہ اُسے کھُردری زبان سے اپنا اور اپنے بچّوں کا جسم صاف کرنے میں بھی مدد ملتی ہے۔

بِلّی کی زبان پر مُڑے ہوئے کانٹے سے ہوتے ہیں، جو بہت غور سے دیکھنے پر ہی نظر آتے ہیں۔ بِلّی کے خاندان کے دوسرے درندوں (مثلاً شیر، چیتے وغیرہ) کی زبان پر ریتی کی طرح دندانے ہوتے ہیں۔ بِلّی آپ کا ہاتھ چاٹے تو آپ کو کھُردُرے پن کا اِحساس ہو گا۔ ہاتھ کی جِلد کو نُقصان نہیں پہنچے گا۔ لیکن شیر آپ کا ہاتھ چاٹے گا تو آپ کے ہاتھ کی کھال اُدھڑ جائے گی۔

عقل ڈاڑھ کسے کہتے ہیں؟

عقل ڈاڑھ یا چار عقل ڈاڑھیں آخری ڈاڑھیں ہوتی ہیں، جو اُس وقت نکلتی ہیں جب اِنسان جوان یعنی عقل مند ہو جاتا ہے۔ آپ کو یہ سُن کر تعجّب ہو گا کہ انگریز بھی اِنہیں عقل ڈاڑھیں (Wisdom Teeth) ہی کہتے ہیں۔

جب بچّہ پیدا ہوتا ہے تو اُس کے مُنہ میں کوئی دانت نہیں ہوتا۔ چھ مہینے کی عُمر میں اُس کے دانت نکلنا شروع ہوتے ہیں، جنہیں دودھ کے دانت کہتے ہیں۔ جب وہ 6 سال کا ہوتا ہے تو دودھ کے یہ دانت گرنا شروع ہو جاتے ہیں اور اِن کی جگہ پکّے یا مُستقِل دانت نکل آتے ہیں۔ 19-20 برس کی عُمر تک اِن کی تعداد 28 ہوتی ہے۔ 20 سے 28 برس کی عمر تک آخری چار ڈاڑھیں، ایک ایک کر کے، نکلتی ہیں، اور جب آخری ڈاڑھ نکل آتی ہے تو اِنسان کے مُنہ میں 32 دانت ہو جاتے ہیں۔ اِن 32 دانتوں کو بتّیسی کہتے ہیں۔

بٹن کب بنے؟

کسی کو معلوم نہیں کہ یہ بٹن جو ہم اپنی قمیص اور کوٹ وغیرہ میں لگاتے ہیں، کب بنے، کس نے بنائے اور اِنہیں سب سے پہلے کس نے اِستعمال کیا۔

بٹن کی اِیجاد سے پہلے لوگ اپنے ڈھیلے ڈھالے لباس (عُبا، قَبا، چوغہ وغیرہ) کو بند کرنے کے لِیے کمر میں ڈوری باندھتے تھے۔ پھر آج سے پانچ چھ سو سال قبل کسی آدمی نے سوچا کہ لباس کے ایک دامن میں کوئی گول یا چپٹی چیز لگادی جائے اور دوسرے دامن میں سوراخ کر کے اِس چیز کو اُس میں پھنسا دیا جائے تو لباس کُھلے گا نہیں اور کمر میں ڈوری یا پٹکا بھی باندھنا نہیں پڑے گا۔ بس اُسی وقت سے بٹن بننا شروع ہو گئے، اور آہستہ آہستہ تمام دُنیا میں اِن کا رِواج ہو گیا۔

بٹنوں کے بارے میں ایک دل چسپ بات سُنیے۔ مردوں کے لباس میں بٹن دائیں طرف ہوتے ہیں اور عورتوں کے لباس میں بائیں جانب۔ لیکن شروع میں دونوں کے لباسوں میں بائیں طرف ہوتے تھے۔ کچھ عرصے بعد مردوں کو اِحساس ہُوا کہ لڑائی کے وقت اُنہیں بائیں ہاتھ سے اپنے چوغے یا لمبے کوٹ کے بٹن کھول کر اُس کے نیچے سے تلوار نکالنے میں دُشواری پیش آتی ہے۔ (تلوار اُن کے بائیں پہلُو میں لٹکی ہوتی تھی جسے وہ دائیں ہاتھ سے میان میں سے نکالتے تھے)۔ اِس دُشواری کو دُور کرنے کے لِیے وہ اپنے لباس کے بٹن دائیں جانِب لگوانے لگے۔

پانی آگ کیسے بُجھاتا ہے؟

جب آپ کسی جلتی ہوئی چیز پر پانی ڈالتے ہیں تو وہ اُس چیز کو اِتنا ٹھنڈا کر دیتا ہے کہ وہ مزید نہیں جل سکتی۔ اِس کے ساتھ ہی آگ کی حرارت پانی کو بھاپ بنا دیتی ہے جو آگ کو چاروں طرف سے ڈھانپ لیتی ہے۔ اِس طرح آگ کو آکسیجن نہیں ملتی اور وہ بجھ جاتی ہے۔

کارخانوں اور دفتروں میں آگ بُجھانے والے سلنڈر ہوتے ہیں۔ اِن میں ایسے کیمیائی مادّے بھرے ہوتے ہیں جو سلنڈر میں سے نکلتے ہی گیس بن جاتے ہیں۔ یہ گیس آگ کو ڈھانپ لیتی ہے، اور جب آگ کو ہوا یعنی آکسیجن نہیں ملتی تو وہ بُجھ جاتی ہے۔

مور کی دُم کہاں ہوتی ہے؟

مور کی دُم اُن خوب صورت، لمبے اور رنگین پروں کے نیچے ہوتی ہے، جو اُس کے پچھلے حصّے میں ہوتے ہیں اور جنہیں پھیلا کر وہ ناچتا ہے۔ چھوٹی سی اِس دُم میں 20 کے قریب چھوٹے چھوٹے سخت اور سادہ پر ہوتے ہیں۔ جب مور ناچنا چاہتا ہے تو دُم کو جھٹکا دے کر اُوپر اُٹھاتا ہے۔ دُم کے اُٹھنے سے اُس کے اُوپر کے رنگین پر بھی اُٹھ کر پھیل جاتے ہیں، اور جب تک مور ناچتا رہتا ہے، اُس کی دُم اِن رنگین پروں کو سہارا دے کر اُوپر اُٹھائے رکھتی ہے۔ جب وہ ناچتے ناچتے تھک جاتا ہے تو دُم کو نیچے کر لیتا ہے، جس سے رنگین پر بھی نیچے گر جاتے ہیں۔ (س۔ل)

اشتیاق احمد

اِنسانیّت کے نام پر

"ابو، ابو، ہمارے دروازے پر پولیس آئی ہے" عارِفہ اُن کی طرف آتے ہوئے بولی۔

"پولیس؟ ہمارے دروازے پر؟ میں دیکھتا ہوں" اُس کے والِد نے پیار سے اُس کے گال پر چپت رسید کی اور اُٹھ کر دروازے کی طرف چلے۔ وہاں واقعی پولیس تھی۔

"شیخ فیّاض احمد آپ ہی ہیں؟" پولیس افسر نے پُوچھا۔

"جی ہاں، بِالکُل، میں ہی ہُوں۔ فرمائیے؟ آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟" شیخ صاحِب نے خوش گوار انداز میں کہا۔

"خدمت تو آپ کی میں کروں گا" پولیس افسر نے ہتھکڑی اُن کے چہرے کی طرف اُٹھائی اور پھر ایک دم اُن کی کلائی میں ڈال دی۔

"یہ...... یہ...... یہ کیا...... یہ کیا کر رہے ہیں آپ؟"

"اپنا فرض ادا کر رہا ہوں۔ آپ کی گرفتاری کے وارنٹ میرے پاس ہیں...... یہ دیکھیے" پولیس افسر نے ایک کاغذ اُن کی آنکھوں کے سامنے لہرایا۔

"میری گرفتاری کے وارنٹ؟ لیکن میرا جُرم کیا ہے؟" شیخ صاحِب نے کہا۔

عارِفہ اُن کی گرِفتاری کا منظر دیکھ چکی تھی۔ اُس نے گھبرا کر اندر کی طرف دوڑ لگا دی اور جلدی جلدی اپنی امّی کو بتانے لگی۔ امّی کے تو ہاتھ پیر پُھول گئے۔ فوراً دروازے کی طرف دوڑیں۔

"آپ کا جُرم یہ ہے کہ آپ چوری کا مال خریدتے اور فروخت کرتے ہیں۔ چور آپ کو بتا دیتا ہے کہ یہ مال چوری کا ہے، اِس کے باوجُود آپ خرید لیتے ہیں۔ جس چور سے آپ مال خریدتے ہیں، وہ پکڑا گیا ہے۔ جب اُس سے پُوچھ گچھ کی گئی تو اُس نے دو تین گھروں میں چوریاں کرنے کا اِقرار کر لیا اور جب اُس سے یہ پوچھا گیا کہ چوری کی چیزیں کہاں ہیں تو اُس نے آپ کا نام اور پتا بتا دیا"۔

"یہ بات بِالکُل جھوٹ ہے۔ آپ میرے گھر کی تلاشی لے سکتے ہیں۔ اگر ایک چیز بھی چوری کی نکل آئے تو میں مُجرِم" شیخ صاحِب نے کہا۔

"بالکل ٹھیک۔ یہ کام تو ہم کریں گے۔ لیکن صاف ظاہر ہے کہ آپ نے چوری کا مال فروخت کر دیا ہو گا۔ تمام مال تو آپ اپنے پاس رکھنے سے رہے"۔

"چلیے، آپ ایک آدھ چیز تو دِکھا دیں نکال کر" شیخ صاحِب بولے۔

"ضرور، کیوں نہیں۔ یہ گھڑی جو آپ کی کلائی پر بندھی ہے، چوری کا مال ہے۔ کیا آپ نے یہ بازار سے خریدی تھی؟" پولیس افسر نے پوچھا۔

"نن نہیں--- ایک ضرورت مند آیا تھا میرے پاس۔ اُس نے کہا تھا کہ وہ پردیسی ہے اور اُس کی جیب کٹ گئی۔ وہ یہ گھڑی بیچ کر اپنا کام نکالنا چاہتا تھا۔ میں نے اُس سے گھڑی خرید لی۔ بس"۔

"یہ بہانا تو ہر کوئی کر سکتا ہے" پولیس افسر نے طنزیہ انداز میں کہا۔

"لیکن اُس چور کی بات کا بھی اِعتبار کس طرح کیا جا سکتا ہے؟"

"اگر یہ گھڑی آپ کے پاس سے نہ ملی ہوتی تو اور بات تھی۔ اِس گھڑی کی چور نے پوری نشانی بتائی ہے"۔

"یہ میرے خِلاف ضرور کوئی سازش ہے۔ آپ میرے بارے میں پورے محلّے سے معلوم کرلیں کہ میں کیسا آدمی ہوں" شیخ صاحِب نے کہا۔

"محلّے والوں کی نظروں میں ہو سکتا ہے آپ بہُت نیک ہوں لیکن بہُت سی باتوں کا عِلم محلّے والوں کو نہیں ہوتا۔ اصل مسئلہ گھڑی کا ہے۔ یہ گھڑی چوری کی ہے اور آپ کے قبضے سے برآمد ہوئی ہے"۔ پولیس افسر بولا۔

"میری بات سُنیں۔ میں ایک اِسکول ٹیچر ہوں۔ میرے شاگرد میرے بارے میں کیا سوچیں گے؟ مجھے اپنی نہیں، اُن کی فکر ہے۔ میں اُن کے سامنے سر نہ اُٹھا سکوں گا۔ اِسکول کی بدنامی الگ ہوگی۔ آپ مُجھ پر رحم فرمائیں اور پہلے اچھی طرح تحقیقات کرلیں۔ اگر میں مُجرِم ثابت ہوگیا تو پھر مجھے گرِفتار کرلیں" شیخ صاحِب نے کہا۔

"اِس مُعاملے میں شک کی کوئی گُنجائش نہیں۔ اور پھر آپ کے وارنٹ جاری ہو چکے ہیں۔ میں مجبور ہُوں۔ چلیے! پولیس کی گاڑی میں بیٹھ جایئے"۔

"اُف! یہ کیا ہو رہا ہے!" اندر سے اُن کی بیوی نے روتے ہوئے کہا۔

"ابوّ--- یہ--- یہ آپ کو کیوں لے جا رہے ہیں؟" عارِفہ نے بھی رو کر کہا۔

"نہ رو، میری بچّی۔ میں تھوڑی دیر میں آجاؤں گا" شیخ صاحِب بولے۔

اور پولیس اُنہیں گاڑی میں بٹھا کر لے گئی۔ ماں بیٹی گاڑی کو جاتے ہوئے دیکھتی رہیں۔ محلّے کے لوگ بھی اِس منظر کو ٹُکر ٹُکر دیکھ رہے تھے۔ کچھ نے چوری پر افسوس کیا تو کچھ کے چہروں کے آثار طنزیہ تھے۔ غالباً وہ یہ خیال کر رہے تھے کہ ماسٹر جی تو چھُپے رُستم نکلے۔

تھانے پہنچ کر پولیس افسر نے اپنے ایک ماتحت سے کہا "صوبے خان چور کو حوالات سے نکال کر لاؤ"۔

"اوکے، سر" اُس نے کہا اور ایڑیوں پر گھوم گیا۔

جلد ہی وہ ایک نوجوان کو ساتھ لیے اندر داخل ہوا۔ اُس پر نظر پڑتے ہی شیخ صاحِب چونک اُٹھے۔

"ارے! یہ تو وہی پردیسی ہے، جس نے میرے ہاتھ گھڑی فروخت کی تھی" اُنہوں نے کہا۔

"یہ پردیسی نہیں، چور ہے، جناب--- اب آپ اِتنے بھولے بھی نہیں" پولیس افسر نے مسکرا کر کہا۔

"اُف! میں آپ کو کیسے یقین دِلاؤں" شیخ صاحِب کا کلیجا مُنہ کو آرہا تھا۔

"آپ خود اِس سے بات کرلیں" پولیس افسر بولا۔

"کیوں، بھئی، کیا تم میرے ہاتھ چوری کی چیزیں

فروخت کرتے رہے ہو؟" شیخ صاحب نے چور سے پُوچھا۔
"ہاں، بالکل" اُس نے فوراً کہا۔
"اتنا سفید جھوٹ بولتے تمہیں خدا کا خوف محسوس نہیں ہوتا؟"
"یہ جھوٹ نہیں، سچ ہے" چور نے کہا۔
"آخر کیا وجہ ہے کہ تم یہ جھوٹ بولنے پر مجبور ہو؟" وہ بولے۔
"یہ جھوٹ کیسے بول سکتا ہے، اور کیوں بولے گا؟ اِسے تو چوری کرتے رنگے ہاتھوں پکڑا گیا ہے" پولیس افسر نے کہا۔
"اُف! اب میں کیا کروں؟" شیخ صاحب بے بسی سے بولے۔
"حوالات کی سیر کریں اور کیا کریں گے؟"۔
یہ کہہ کر پولیس افسر نے چور کو حوالات میں لے جانے کا اِشارہ کیا اور شیخ صاحب کا بیان لکھنے لگا۔ کچھ دیر بعد اُس نے کہا "یہ آپ کا بیان ہے۔ آپ اِس کو پڑھ کر دستخط کر دیں"۔
"میں دستخط کر دیتا ہوں۔ لیکن کیا آپ اِنسانیت کے نام پر میری ایک بات مانیں گے؟" شیخ صاحب نے پوچھا۔
"کہیئے، کیا بات ہے؟"
"آپ فرض کرلیں کہ اِس چور کا بیان جھوٹا ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اِسے مجھ پر اِلزام لگانے کی کیا ضرورت تھی۔ اگر آپ یہ بات فرض کر کے اِس مُعاملے کی تفتیش کریں گے تو ایک بے گُناہ سزا سے بچ جائے گا۔ اب آپ سوچیں گے کہ آپ یہ کام کیوں کریں، آپ کو ایسا کرنے کی کیا ضرورت ہے، تو میں صِرف اِتنا کہوں گا کہ اِنسانیّت کے نام پر ایسا کریں"۔
پولیس افسر سوچ میں پڑ گیا۔ کچھ دیر بعد اُس نے کہا "آج تک میں نے اِنسانیّت کے نام پر کوئی کام نہیں کیا۔ لیکن نہ جانے کیوں، آج میں سوچ میں پڑ گیا ہوں۔ شاید

اِس کی وجہ آپ کی بچّی ہو۔ میں نے جب اُس کی آنکھوں میں آنسو دیکھے تھے تو میرا دل ہِل گیا تھا۔ اب میں یہ بات فرض کر کے اپنا کام شروع کرتا ہوں۔ آگے جو اللہ کو منظور"۔

"بہت بہت شکریہ" شیخ صاحِب خوش ہوگئے۔

پولیس افسر نے ایک الگ کمرے میں جاکر چور کو بُلایا، چند لمحے اُسے گھورتا رہا پھر بولا "تمہارا جھوٹ پکڑا گیا!"

"جی، کیا مطلب؟" چور نے پریشان ہو کر کہا۔

"تم نے واقعی پردیسی بن کر وہ گھڑی ماسٹر صاحِب کے ہاتھ فروخت کی تھی۔ آخر تم نے اُن پر اِتنا بڑا اِلزام کیوں لگایا؟"

"ایسی کوئی بات نہیں، جناب۔ ماسٹر صاحِب چوری کی چیزیں مُجھ سے خریدتے رہے ہیں" چور نے کہا۔

"اِسے اُلٹا لٹکا دو۔ یہ اِس طرح نہیں مانے گا" پولیس افسر نے سپاہیوں کو حکم دیا۔

"نن--- نہیں--- آخر میں نے کیا کیا ہے؟ آپ مجھے کس جرم میں اُلٹا لٹکا رہے ہیں؟"

"ایک شریف آدمی کو پھنسوانے کے جرم میں--- لٹکا دو اِسے اُلٹا!"

سپاہی اُس کے پیر باندھنے لگے۔ اُس کا رنگ اُڑنے لگا۔ پھر جب اُس کا اُلٹا سر اُوپر اُٹھنے لگا تو وہ تھر تھر کانپنے لگا۔ اُس نے چیخ کر کہا "اِنسپکٹر صاحِب، ٹھہر جائیں۔ میں سچ سچ بتاتا ہوں"۔

"ٹھہر جاؤ!---- اِسے بتانے دو" افسر نے کہا۔

چور کا جسم فرش پر آ رہا۔ چند سیکنڈ تک وہ ہانپتا رہا پھر اُس نے کہا:

"سچ یہ ہے کہ میں نے صِرف ایک گھڑی پردیسی بن کر ماسٹر صاحِب کے ہاتھ فروخت کی تھی"۔

"کیا؟" پولیس افسر چِلاّ اُٹھا۔

"ہاں، جناب۔ حقیقت یہی ہے"۔

"تب، تم نے اِتنا بڑا جھوٹ کیوں بولا؟ ایک شریف اِنسان کے ہاتھوں میں ہتھکڑی لگوا دی تم نے"۔

"میں چودھری بشیر کا مُلازِم ہوں اور ہم لوگ نمک حرامی نہیں کرتے۔ چودھری بشیر کے بیٹے کو ماسٹر صاحِب نے سالانہ اِمتحان میں فیل کر دیا تھا۔ اِس سے پہلے چودھری صاحِب نے ماسٹر جی کے گھر جاکر اُن سے مُلاقات کی تھی اور اُنہیں پانچ ہزار روپے پیش کیے تھے کہ وہ اُن کے نالائق بیٹے کو پاس کر دیں۔ لیکن ماسٹر صاحب نے رِشوت کی رقم کی طرف آنکھ اُٹھا کر بھی نہیں دیکھا تھا۔ چودھری صاحب کا بیٹا فیل ہوگیا تو اُنہوں نے ایک گھڑی مجھے دی جو میں نے

پردیسی بن کر اُن کے ہاتھ فروخت کی۔ اِس کے بعد چودھری صاحِب نے مجھے ایک دوست کے گھر بھیج دیا اور اُس نے پروگرام کے مُطابِق پولیس کو فون کر دیا۔ اِس طرح مجھے رنگے ہاتھوں پکڑوا دیا گیا۔ چودھری صاحِب نے مجھے تسلّی دی تھی کہ وہ فوراً میری ضمانت کروا دیں گے اور اپنے اثر و رسوخ سے میرے خلاف کیس بھی ختم کروا دیں گے"۔

"اُف! اگر میں اِنسانیّت کے نام پر تمھیں اُلٹا نہ لٹکاتا تو ایک بے گُناہ کو جیل جانا پڑتا۔ تم سے اور تمہارے چودھری سے تو میں بعد میں نِبٹوں گا، پہلے اُس غریب کو حوالات سے نکالتا ہوں"۔

یہ کہہ کر پولیس افسر حوالات کے پاس گیا اور سپاہی کو تالا کھولنے کا اِشارہ کیا۔ شیخ صاحِب باہر آئے تو اُس نے اُن سے کہا "اِنسانیّت کے نام پر میری آپ سے ایک درخواست ہے"۔

"جی؟ کیا مطلب؟ یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ آپ اور مُجھ سے درخواست کریں؟ اور میں نے جو اِنسانیّت کے نام پر ایک درخواست آپ سے کی تھی، اُس کا کیا بنا؟" شیخ صاحِب نے پُوچھا۔

"میں اُس پر عمل کر چکا ہوں۔ آپ بے گُناہ ثابِت ہو چکے ہیں" پولیس افسر مسکرا کر بولا۔

"لیکن کیسے؟" شیخ صاحِب بھونچکا رہ گئے۔

"میرے کمرے میں آیئے۔ میں آپ کو ساری کہانی سُناتا ہوں" س

ساری کہانی سُنانے کے بعد پولیس افسر نے کہا "اب آپ اپنے گھر جا سکتے ہیں۔ آپ پر کوئی اِلزام نہیں"۔

"بہُت بہُت شکریہ۔ آپ نے اِنسانیّت کی لاج رکھ لی"۔

یہ کہہ کر ماسٹر صاحِب نے پولیس افسر سے ہاتھ مِلایا اور باہر جانے لگے، لیکن پولیس افسر کی آواز نے اُن کے پاؤں جکڑ لیے۔ "ٹھہریئے!"

وہ ڈر گئے۔ دِل دھڑکنے لگا۔

"میں خود آپ کو چھوڑ کر آؤں گا" پولیس افسر نے کہا۔

"اِس کی کیا ضرورت ہے؟ میں خود چلا جاؤں گا" شیخ صاحِب بولے۔

"اِس کی ضرورت ہے۔ بلکہ شدید ضرورت ہے" پولیس افسر نے کہا۔

"کیا فرمایا؟ شدید ضرورت؟" وہ حیرت زدہ رہ گئے۔

"ہاں، شدید ضرورت"۔ یہ کہہ کر وہ اُنہیں باہر لے گیا۔ وہاں جیپ کھڑی تھی۔ اُس نے اُنہیں جیپ میں بٹھایا اور اُن کے گھر کی طرف چل دیا۔

"وہ شدید ضرورت کیا ہے؟ اوہ! میں سمجھا۔ آپ کچھ چاہتے ہیں مُجھ سے۔ لیکن جناب، اگر میں رِشوت کا قائل ہوتا تو پھر چودھری بشیر سے رِشوت لے لیتا" شیخ صاحِب نے راستے میں کہا۔

"آپ غلط سمجھے۔ بالکل غلط سمجھے" پولیس افسر بولا۔

"تو پھر وہ شدید ضرورت کیا ہے؟" شیخ صاحِب نے پُوچھا۔

"یہ میں آپ کے دروازے پر پہنچ کر بتاؤں گا"۔

شیخ صاحِب کے دروازے پر پہنچ کر دونوں جیپ سے اُترے۔ پولیس افسر نے کہا "اپنی بچّی کو بُلایئے"۔

وہ اندر گئے، بیوی کو اپنی رِہائی کی خبر سُنائی اور پھر بچّی کو لے کر باہر آئے۔ بچّی کا چہرہ خوشی سے گُلنار ہو رہا تھا۔

"بس، یہی تھی وہ شدید ضرورت --- میں جب آپ کو گرِفتار کر کے لے جا رہا تھا تو اُس وقت میں نے اِس معصوم فرشتے کی آنکھوں میں آنسو دیکھے تھے۔ اب میں اِس کے چہرے پر خوشی دیکھنا چاہتا تھا"۔

"اوہ!" ماسٹر صاحِب کا مُنہ حیرت سے کُھل گیا۔

پولیس افسر کی جیپ واپس جانے کے لِیے مُڑ رہی تھی۔

محمّد عارف قریشی

قائدِاعظمؒ تجھے سلام

تو ہے ہمارا قائدِاعظم ' تجھے سلام
روشن رہے گا قوم کی نظروں میں تیرا نام
بخشی ہے تو نے ہم کو یہ آزاد زندگی
یہ زندگی سجاتی ہے خوشیوں کے صبح و شام
سارے جہاں میں شان ہمارے وطن کی ہے
تو نے دیا ہے ہم کو زمانے میں یہ مقام
انگریز تجھ سے ہار کے مانا تھا تیری بات
تیری ہی ہمتوں سے ہے اونچا ترا مقام
مل جل کے ہم کو رہنے کا جذبہ عطا کیا
تنظیم و اتحاد رہا ہے ترا پیام
گھبرا کے آفتوں سے نہ ہاریں گے حوصلہ
بھولے نہیں ہیں، یاد ہے ہم کو ترا کلام
تو نے ہمارے واسطے کی زندگی نثار
تیرے لیے دعائیں ہیں ملت کی صبح و شام
تیری ہی کوششوں سے ملا ہم کو یہ وطن
تیرے عظیم کاموں سے زندہ ہے تیرا نام
یہ پاک سر زمیں تو تری یادگار ہے
آزاد ہم ہیں، پیارے وطن پر بہار ہے

مُرغ چھولے

رِفعت شاہین

"باجی، کیا پکا ہے؟" ناصر اپنا آدھا دھڑ کچن میں اُلٹ کر بولا۔

"ٹنڈے پکائے ہیں" باجی نے کہا مگر اُس کے بگڑے ہوئے تیور دیکھ کر فوراً بولیں۔ "دال ٹنڈے پکائے ہیں۔ تم دال کھا لینا۔ تمہیں ٹنڈے پسند نہیں ہیں ناں"۔

"تم دال کھا لینا" ناصر نے باجی کی نقل اُتاری "جب پتا ہے کہ میں یہ فضول چیزیں نہیں کھاتا تو کیوں پکاتی ہو؟"

وہ چیختا، پیر پٹختا اپنے کمرے میں چلا گیا۔

"جب دیکھو ٹنڈے، جب دیکھو کریلے، توریاں۔ اِن کے سوا اِنہیں کچھ نہیں ملتا پکانے کو" وہ کمرے میں جا کر بھی بڑبڑا رہا تھا۔ یہ اُس کی روز کی عادت تھی۔ گھر میں کچھ بھی پکتا، وہ یوں ہی مُنہ بگاڑتا۔ سبزی سے تو اُسے چڑ تھی۔ دوسرے کچھ امّی کے لاڈ پیار نے بھی اُسے بگاڑ دیا تھا۔ ابّو نے کبھی اِن باتوں میں دخل نہیں دیا تھا۔ وہ صرف ایک ہی بات کا دھیان رکھتے کہ بچّے پڑھائی میں نرم نہ پڑیں۔

"ناصر کہاں ہے؟ اُسے بھی بُلا لو" امّی کی آواز کمرے میں پہنچی تو وہ سمجھ گیا کہ کھانا میز پر لگ چکا ہے۔ وہ اور مُنہ پُھلا کر بیٹھ گیا۔

"وہ ٹنڈے نہیں کھائے گا" باجی نے کہا۔

"یہ شملہ گوشت بھی تو ہے" امّی بولیں۔

"شملے کی مرچوں کا تو وہ سدا کا دُشمن ہے" باجی نے کہا۔

ابّو بولے "ارے بھئی، مجھے تو کھانے کی خوش بو ہی ہلکان کیے دے رہی ہے۔ بُلاؤ تو اُسے۔ کہاں ہے؟"۔

"اُس کا بھی کوئی حال نہیں۔ اُس نے کبھی گھر کا کوئی پکوان پسند نہیں کیا" ساجد نے نوالہ مُنہ میں رکھتے ہوئے کہا۔ اُسی وقت امّی ناصر کو منا کر لے آئیں۔ مگر وہ بھی ضِد کا پکّا تھا۔ ایک نوالہ تک نہ لیا۔ امّی سے بولا "آپ مجھے پیسے دیں۔ میں بازار سے کچھ کھاؤں گا"۔

"بس یہی تو چاہتا ہے یہ۔ بازار کی چٹ پٹی چیزیں اِسے اچھی لگتی ہیں" ساجد نے کہا۔ امّی نے ناصر کو پیسے دِیے اور وہ باہر بھاگ گیا۔

"اب یہ سڑک کے کنارے کھڑی ریڑھی سے مُرغ چھولے لے کر کھائے گا، ٹریفک کے دُھوئیں، دُھول اور مکھیوں کے اچار کے ساتھ" ساجد بولا۔

"معافی چاہتا ہوں۔ مجھے تھوڑی سی دیر ہو گئی" حمزہ بھیّا تیزی سے بیٹھتے ہوئے بولے۔

"گلے میں خراش تھی کیا؟" ساجد نے پوچھا۔

"یہ ناصر کہاں ہے؟" حمزہ بھیّا ساجد کی بات سُنی اَن سُنی کر کے بولے۔

"بازار گیا ہے" ساجد نے بتایا۔

"کیوں؟" بھیّا نے پوچھا۔

"اِس لیے کہ کھانے کا وقت ہو گیا تھا۔ ڈر رہا تھا کہیں گھر کا صاف سُتھرا کھانا نہ کھا لے" ساجد نے کہا "امّی آپ اُسے بگاڑ رہی ہیں"۔

"تو پھر کیا کروں؟ بھوکا رہنے دیا کروں؟" امّی بولیں۔

"آپ جانتی ہیں، وہ بازار سے کیا کھاتا ہے؟" حمزہ بھیّا نے کہا۔

"بازار کی چیزوں میں صفائی کا دُور دُور تک خیال نہیں رکھا جاتا۔ میں تو مجبوری میں بھی نہ کھاؤں" ساجد نے کانوں کو ہاتھ لگائے۔

"امّی، اِس طرح وہ بیمار بھی پڑ سکتا ہے" بھیّا نے خدشہ ظاہر کیا۔

"خدا نہ کرے" امی ایک دم پریشان ہو گئیں۔

دوپہر کو، کھانے کے وقت، عارف چچا کے آنے کی اِطلاع ملی تو ساجد کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہ رہا۔ لیکن ناصر بُرے بُرے مُنہ بنانے لگا "ہُوں! ہر وقت نصیحت، ہر وقت روک ٹوک۔ مجھے تو یہ عارف چچا زہر لگتے ہیں"۔

"ارے، اب مزہ آئے گا" ساجد نے نعرہ لگایا تو ناصر نے اُسے کھانے کی میز کی طرف دھکیل دیا۔ وہ ساجد کی خوشی سے چِڑ گیا تھا۔ ساجد کو سخت بھوک لگی تھی۔ وہ کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولا "امّی، جلدی سے مجھے کچھ کھانے کو دیں"۔

"اِسے کوئی گندی سندی چیز دے دیں" ناصر نے اُس پر چوٹ کی۔

"ناصر، تم بہت بد تمیز ہوتے جا رہے ہو۔ کل بھیّا بھی ڈانٹ رہے تھے" باجی نے اُسے ٹوکا۔

"تو اور کیا کہوں؟ یہ سالن دیکھو۔ کس کا جی چاہے گا اِسے کھانے کو؟" ناصر نے ڈونگے کا ڈھکّن اُٹھا کر کہا۔

"اگر کھانا نہیں ہے تو بُرا بھی مت کہو" ساجد نے اُس کے ہاتھ سے ڈھکّن چھینا۔

"بس اب ختم سب فضول باتیں۔ چلو ناصر، سالن لو اور خاموشی سے کھانا کھاؤ" امّی نے ذرا سختی سے کہا۔

"مجھے کیا ضرورت ہے یہ بد مزہ کھانا کھانے کی؟ ارے، ہم تو چٹ پٹے مسالے دار مُرغ چھولے کھا کر آ رہے ہیں" یہ کہہ کر وہ پیٹ پر ہاتھ رکھ کر دوہرا ہو گیا اور لگا ہائے ہائے کرنے۔

"پیٹ میں بڑے زور کا درد اُٹھا ہے" وہ تھوڑا سیدھا ہو کر بولا۔

"مرغ کاٹ رہا ہو گا" ساجد نے مذاق اُڑایا۔

"امّی!" وہ درد سے کراہا "بہت درد ہو رہا ہے"۔ اب تو ساجد بھی پریشان ہو گیا۔ ابّو اور حمزہ بھیّا گھر پر نہیں تھے۔

"امّی، ڈاکٹر کو بُلا لیں" باجی کا رنگ زرد ہو رہا تھا۔

تھوڑی ہی دیر میں ساجد ڈاکٹر کو بُلا لایا۔

"میرے خیال میں یہ تیز مرچ مسالوں والی چیزیں کھاتا رہا ہے" ڈاکٹر صاحب نے کہا۔

"جی، ڈاکٹر صاحب" ناصر نے کراہتے ہوئے کہا۔

"آپ اِسے ہسپتال لے جائیں۔ میرے خیال میں معدے کا اَلسر ہو گیا ہے" ڈاکٹر صاحب بولے۔

"میں--- ہسپتال نہیں جاؤں گا" ناصر نے ڈر کر کہا۔

"ہسپتال نہیں جاؤ گے تو آرام کیسے آئے گا؟" ساجد نے پیار سے کہا تو ناصر اُسے غور سے دیکھنے لگا۔

وُہی ساجد جس سے اُس نے کبھی ادب و لحاظ سے بات نہیں کی تھی، آج اُسے اپنے سے ایک سال نہیں، بہت سال بڑا لگا۔

ابّو اور حمزہ بھیّا رات کو نو بجے گھر آئے تو ناصر کو بیماروں کی طرح بستر پر پڑا دیکھ کر پریشان ہو گئے۔ جب اُنہیں

پتا چلا کہ بازار کی چٹ پٹی اور گندی چیزوں نے اپنا کام دکھا دیا ہے تو حمزہ بھیّا ایک دم غصّے میں آ گئے۔ بولے "بُہت اچھا ہُوا۔ ایسا ہی ہونا چاہیے تھا، تمھارے ساتھ۔ اب اِس بیماری میں بالکُل پھیکے اور بدمزہ کھانے کھانا پڑیں گے تو سارے چٹخارے بھول جاؤ گے۔ اور کھاؤ بازار کی چٹ پٹی چیزیں"۔

بھیّا غصّہ نکال چکے تو پیار سے ناصِر کو گلے لگا لیا۔ اُس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ بڑوں کا کہا نہ مانیں تو یوں ہی تکلیف اُٹھانا پڑتی ہے۔

ایک ہفتہ وہ ہسپتال میں رہا۔ ڈاکٹروں نے بالکُل پھیکا کھانا کھانے کی ہدایت کی تھی۔ اُس کے لیے یہ سب برداشت سے باہر تھا۔ کہاں تیز مسالوں والی چاٹ، مُرغ چھولے اور برگر وغیرہ اور کہاں اُبلی ہُوئی سبزیاں اور سُوپ۔ لیکن اُسے مجبوراً یہ بدمزہ چیزیں کھانا پڑ رہی تھیں۔

"چچا جان نہیں آئے" شام کو پھیکا سیٹھا سُوپ پی کر ناصِر نے ساجد سے پُوچھا۔

"ارے ہاں، مجھے یاد ہی نہیں رہا۔ ویسے اُنھیں آ جانا چاہیے تھا اب تک" ساجد بولا۔

"ارے بچّو، مجھے یاد کیا جا رہا ہے؟" یہ آواز عارِف چاچا ہی کی تھی۔ دونوں اُچھل پڑے۔ اب وہ دونوں تھے اور چچا جان۔ ناصِر کے بارے میں اُنھیں سب کچھ امّی سے پتا چل گیا تھا۔ وہ اُس کا حال پُوچھ کر اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے، مگر اُسے کوئی نصیحت نہ کی۔ کیوں کہ وہ اُن کی نصیحتوں سے چِڑتا تھا، جب کہ ساجد کو اُن کی سمجھانے بُجھانے کی عادت بُہت پسند تھی۔

"چچا جان، آج آپ مجھے کوئی نصیحت نہیں کریں گے؟" ناصِر نے بڑے سنجیدہ لہجے میں کہا۔

عارِف چچا کے ساتھ ساجد نے بھی اُسے حیرت سے دیکھا۔ پھر عارِف چچا بولے "سب سے پہلے یہ بتا دوں کہ ٹھوکر لگنے کے بعد نہیں، ٹھوکر لگنے سے پہلے ہی آدمی کو اِس بات کا اندازہ کر لینا چاہیے کہ یہاں چوٹ بھی لگ سکتی ہے۔ ناصِر بیٹا، میں تم سے زیادہ کچھ نہیں کہوں گا۔ صِرف اِتنا کہوں گا کہ بڑوں کی نافرمانی کرنے والوں سے اللہ تعالیٰ ناراض ہوتا ہے۔ تم بڑوں کے منع کرنے کے باوجود بازار کی چیزیں کھاتے رہے۔ چُناں چہ اللہ تم سے ناراض ہو گیا۔ اور جو اللہ کو ناراض کرتا ہے، اللہ اُسے سزا دیتا ہے۔ تمھیں بھی سزا ملی"۔

"میں شرمندہ ہُوں، چچا جان" ناصر نے کہا۔ اُسی وقت باجی نے آ کر کہا "چلیں، اب اُٹھیں بھی۔ کھانا ٹھنڈا ہو جائے گا"

وہ کوئی تیسری بار بُلانے آئی تھیں۔

"باجی، میں کھچڑی نہیں کھاؤں گا، شلجم گوشت کھاؤں گا"۔ ناصر نے کہا تو ساجد نے زبردستی اُس کے مُنہ میں کھچڑی بھرا چمچ ڈال دیا اور بولا "صِحّت کی صِرف نہیں ہے بات، لذّت بھی ہے ساتھ ساتھ"۔ چچا جان سمیت سب ہنس رہے تھے۔ مگر ناصِر کے لیے ہنسنا بُہت مشکِل ہو رہا تھا۔

ایک شخص کی موٹر کار کسی گاؤں کے قریب کیچڑ میں پھنس گئی۔ ایک دیہاتی اُدھر سے گزرا تو اس شخص نے پانچ روپے دے کر اس سے کار کیچڑ میں سے نکلوائی۔

جب وہ جانے لگا تو اس نے دیہاتی سے کہا "یہاں تو ایسے واقعات اکثر ہوتے رہتے ہوں گے"۔

دیہاتی بولا "جی ہاں، صاحب۔ آج یہ پانچویں کار میں نے کیچڑ میں سے نکالی ہے"۔

وہ شخص بولا "جب تم سارا دن کیچڑ میں سے کاریں ہی نکالتے رہتے ہو تو اپنا کام تو رات کو کرتے ہو گے؟"

دیہاتی نے کہا "جی ہاں، صاحب۔ میں اپنا کام رات ہی کو کرتا ہوں"۔

"تم کیا کام کرتے ہو؟" کار والے نے پوچھا۔

"اس گڑھے میں پانی ڈالتا ہوں" دیہاتی نے جواب دیا۔

(غلام شعیب، فیصل آباد)

کسی شخص کو لائبریری کی کتاب میں ایک درزی کی دو سال پرانی رسید ملی جو کسی قمیص کے بارے میں تھی۔ وہ یہ سوچ کر کہ قمیص کا مالک مر کھپ گیا ہو گا، درزی کی دکان پر پہنچا اور اسے رسید دے کر قمیص مانگی۔

درزی نے رسید دیکھ کر سر کھجایا اور پھر دکان کے اندرونی حصے میں چلا گیا۔ کچھ دیر بعد وہ واپس آیا اور اس شخص کو رسید دے کر کہنے لگا "آپ کی قمیص، اِن شاء اللہ منگل تک تیار ہو جائے گی"۔

(محمد شاہد احسن، پیراں غائب ملتان)

مریض (ڈاکٹر سے): ڈاکٹر صاحب، آپ کو یقین ہے کہ میں آپ کے علاج سے ٹھیک ہو جاؤں گا؟"

ڈاکٹر: بالکل ٹھیک ہو جاؤ گے۔ یہ ایسا مرض ہے کہ دس میں سے ایک ہی مریض بچتا ہے۔ اب تک 9 مریض مر چکے ہیں۔ تم دسویں ہو۔ تم یقیناً بچ جاؤ گے"۔

(ملک ثاقب محمود اعوان، کھاریاں)

اسکول ٹیچر نے بچوں کو نیوٹن کا واقعہ سناتے ہوئے کہا "ایک دِن نیوٹن، صبح کے وقت، باغ میں سیب کے درخت کے نیچے بیٹھا ہوا تھا کہ اس کے سر پر ایک سیب آگرا اور یوں اس نے کششِ ثقل کا اصول دریافت کیا"۔

یہ کہہ کر اس نے بچوں سے پوچھا "آپ نے اس بات سے کیا سبق حاصل کیا؟"

ایک بچہ بولا "سر، ہم نے اس بات سے یہ سبق حاصل کیا کہ اسکول سے غائب ہونا کتنی اچھی بات ہے۔ اگر نیوٹن اس دن اسکول گیا ہوتا تو یہ اصول کبھی دریافت نہ کرتا"۔

(ارم بتول، چشمہ بیراج)

ایک دیہاتی مریض اپنی بیوی کے ساتھ ہسپتال گیا۔ اس کی حالت خراب تھی، اس لیے ڈاکٹر نے اسے ہسپتال میں داخل کر لیا۔

دوسرے دن، صبح کو، ڈاکٹر مریضوں کا معاینہ کرنے کے لیے آیا تو اس مریض کے بستر پر اس کی بیوی بیٹھی تھی اور وہ خود غائب تھا۔

ڈاکٹر نے پوچھا "مریض کہاں ہے؟"

بیوی بولی "وہ گائے دوہنے گیا ہے"۔

(لبید احمد سالک، اعوان ٹاؤن لاہور)

آپ جانتے ہیں؟

○ مصنوعی سیارے اِنسان کے بنائے ہوئے سیارے ہیں۔ اِن کے ذریعے موسم کا حال معلوم کیا جاتا ہے اور دُور دراز کے عِلاقوں میں ریڈیو کی نشریات بھیجی جاتی ہیں۔

○ دُنیا کے سات عجائبات میں سے صِرف ایک اُعجوبہ (اَہرامِ مِصر) ہی تباہی سے بچا ہے۔ باقی تمام عجائبات تباہ ہو چکے ہیں۔

○ دُنیا کی سب سے بڑی خلیج "ہڈسن بے" ہے۔ یہ شِمالی کینیڈا میں ہے۔ خلیج (Bay) سمندر کے اُس حصّے کو کہتے ہیں جو خُشکی میں دُور تک چلا گیا ہو۔ خلیج ہڈسن، خلیج بسکے، خلیجِ بنگال اور خلیج فارس دُنیا کی مشہور خلیجیں ہیں)۔

○ دُنیا کی سب سے اُونچی عمارت امریکا کے ایک شہر شکاگو کی "سیئرس ٹاور" ہے۔ 445 میٹر اُونچی اِس عمارت کی 110 منزلیں ہیں۔

○ ریلوے کا جو مُلازِم مسافروں کے ٹکٹ چیک کرتا ہے، اُسے "ٹی ٹی اِی" کہتے ہیں۔ TTE کا مطلب ہے: "ٹریولنگ ٹکٹ اگزامِنر" یعنی سفر کے ٹکٹوں کی جانچ پڑتال کرنے والا۔

○ جواہرات میں سب سے سخت جوہر، یعنی قیمتی پتّھر، ہیرا ہے۔ یہ خالص کاربن ہوتا ہے۔

○ سانپ پرندوں کے انڈے سمُوچے نِگل جاتا ہے۔ جب وہ پیٹ میں جاکر ٹوٹ جاتے ہیں تو وہ اُن کے چھلکے اُگل دیتا ہے۔

○ چین کے لوگ پرندوں کے گھونسلوں کا سُوپ پیتے ہیں۔

○ امریکا کے ایک سابِق صدر، جمی کارٹر، نے 1969ء میں ایک اُڑن طشتری فضا میں اُڑتی ہوئی دیکھی تھی۔

○ امریکا کی ایک عورت کا نام "میری کرسمَس" ہے۔

○ 80 سال پہلے، جب پہلی جنگِ عظیم شروع ہوئی تو اُس وقت امریکا کی فضائیہ (ایئر فورس) میں صِرف 50 فوجی تھے۔

○ ایک عرب مُلک، اومان، میں 1970ء تک ڈھول بجانا خلافِ قانون تھا۔

○ ایک انگریز باغ بان نے ایک ایسا ٹماٹر اُگایا ہے جس کی شکل چوکور (مُربّع) ہے۔

○ 1995 سال پہلے، حضرت عیسیٰ علیہِ السّلام کی پیدائش کے وقت، دُنیا کی آبادی 25 کروڑ کے لگ بھگ تھی۔ 1650ء میں یہ تعداد دوگنی یعنی 50 کروڑ اور 1850ء میں مزید دوگنی یعنی ایک ارب ہوگئی۔ 1930ء میں دُنیا کی کُل آبادی دو ارب تھی۔ 1970ء میں 3 ارب اور 1988ء میں 5 ارب تک پہنچ گئی۔ آبادی میں اِضافے کی یہی رفتار رہی تو پانچ سال بعد (2000ء تک) 6 ارب کے لگ بھگ ہو جائے گی۔ اِتنے لوگ کہاں رہیں گے، اور کیا کھائیں گے؟

○ روزانہ لاکھوں شہاب ثاقِب خلا سے زمین کی فضا میں داخل ہوتے ہیں۔ لیکن اِن میں سے زیادہ تر زمین کی سطح تک پہنچنے سے پہلے ہی، ہوا کی رگڑ سے، جل بھُن کر راکھ ہو جاتے ہیں۔

○ 1908ء میں روس کے ایک عِلاقے، سائبیریا، میں ایک بہُت بڑا شہابِ ثاقِب گرا تھا۔ اُس میں 40,000 ٹن لوہا تھا اور اُس نے سائبیریا میں بہُت تباہی مچائی تھی۔

اپنی تحریریں اِس پتے پر بھیجیے
ماہنامہ تعلیم وتربیت
32 شارع بن بادیس لاہور

باتیں بڑوں کی

○ اللہ کے بندوں کے ساتھ اچھے اخلاق سے پیش آؤ۔ (حضورِ اکرم ﷺ)

○ اگر تو گناہ پر آمادہ ہے تو ایسی جگہ تلاش کر جہاں خدا نہ ہو۔ (حضرت عثمانؓ)

○ دُنیا کی عزّت مال سے ہے اور آخرت کی عزّت اعمال سے۔ (حضرت عُمرؓ)

○ تمام خوبیوں کا مجموعہ علم سیکھنا، اُس پر عمل کرنا اور اُسے دوسروں کو سکھانا ہے۔ (حضرت علیؓ)

○ طاقتور وہ ہے جو غصّے کو پی جائے (جُنید بغدادیؒ)

○ کسی سے بدلہ لینے میں جلدی نہ کرو اور کسی سے نیکی کرنے میں دیر نہ کرو۔ (شفیق بلخی)

○ دوست ہزار بھی کم ہیں اور دُشمن ایک بھی زیادہ ہے۔ (نصیر الدّین طوسی)

○ جو خدا سے ڈرتا ہے اُس سے سب ڈرتے ہیں۔ (حسن بصری) (نام نہیں لکھا)۔

○ اِس میں کوئی شک نہیں کہ عید کے دن غسل کرنا، نئے کپڑے پہننا اور عطر لگانا سُنّت ہے۔ لیکن یہ سُنّت ہمارے ظاہری بدن کی صفائی کے لیے ہے۔ ہمارے اِن صاف، اُجلے اور نئے کپڑوں اور نہائے ہوئے اور خوشبو ملے ہوئے جسم کے اندر اگر ہماری رُوح سُنّت کے خِلاف حرکتوں اور اللہ کی نافرمانیوں کی نجاست میں لتھڑی ہوئی ہو تو اِن نئے کپڑوں اور نہائے ہوئے بدن کی ظاہری ٹیپ ٹاپ کا کیا فائدہ؟ یہ تو ایسا ہو گا جیسے زہر کی پُڑیا پر شہد کی چٹ لگا دی جائے۔

("فیضانِ سُنّت" از مولانا محمّد اِلیاس قادری)
(بلال حمید، سوڈی وال لاہور)

○ دوست کا عیب اُس سے چھپانا خیانت اور دوسروں کو بتانا عیب ہے۔ (ابنِ زیدون)

○ نافرمان بیٹے کا وجود سانپ کے زہر سے زیادہ مُہلک ہوتا ہے۔ (شیکسپیئر)۔

○ میں خوش رہتا ہوں کیوں کہ میں کسی سے کچھ نہیں مانگتا۔ (آئن سٹائن)۔ عظمیٰ اسلم، اوکاڑا۔

○ جو اپنے دوست کو بُرے کام سے باز نہیں رکھ سکتا، وہ دوستی کے قابل نہیں۔ (جالینوس)

○ علم دل کو ایسے زندہ رکھتا ہے جیسے بارش زمین کو۔ (ابراہیم لنکن)۔ عامر سلمان مُراد، سیالکوٹ۔

○ زیادہ باتیں وہ کرتے ہیں، جن کے پاس کرنے کو کچھ نہیں ہوتا۔ (شیخ سعدیؒ)

○ دوسروں کو مُعاف کردو، لیکن اپنے آپ کو ہرگز مُعاف نہ کرو۔ (امام غزالی)

○ جو اچھی کتابیں نہیں پڑھتا اور جو بالکل نہیں پڑھتا، دونوں میں کوئی فرق نہیں۔ (مارک ٹوئن)

○ اِنصاف میں دیر کرنا، اِنصاف سے اِنکار ہے۔ (گلیڈ اسٹون)۔

○ جس راز کو دُشمن سے چھپانا چاہتے ہو، اُسے دوست پر بھی ظاہر نہ کرو۔ (فیثا غورس) عمّار احمد۔

○ سب سے زیادہ عقل مند وہ شخص ہے جو اپنی بات کو اچھی طرح ثابت کر سکے۔ (حضرت عُمر فاروق رضی اللہ عنہ)

○ دنیا میں جو چیز سب سے کم ہے وہ سچّائی اور امانت ہے، اور جو چیز سب سے زیادہ ہے، وہ جھوٹ اور خیانت ہے۔ (حضرت علیؓ)

منصور احمد سومرو۔ واپڈا کالونی گڈو۔

○ جس شخص کی عقل کامل ہو جاتی ہے، وہ کم بولتا ہے۔ (حضرت ابوبکر صدیقؓ)

○ لباس کی سادگی ایمان کی علامتوں میں سے ایک علامت ہے۔ (حضورِ اکرم ﷺ)
○ حقیر سے حقیر پیشہ اِختیار کرنا کسی کے آگے ہاتھ پھیلانے سے حد درجہ بہتر ہے۔ (حضرت عثمانؓ)
○ جس نے عِلم حاصل نہ کیا' وہ یتیم ہے۔ (حضرت علیؓ)
○ محنت میں کام یابی کا راز چُھپا ہوا ہے۔ (قائدِاعظم محمّد علی جناحؒ)
○ ہمّت ہارنا ناکامی کی طرف پہلا قدم ہے۔ (علامہ محمّد اِقبالؒ) تنویر احمد' محلّہ رحیم آباد' راول پنڈی۔
○ خوش رہنا چاہتے ہو تو دوسروں کو خوش کرنے کی کوشش کرو۔ (شیخ عبدُالقادِر جیلانیؒ) عظیمُ الدّین' ظاہر پیر۔
○ سُلطان محمود غزنوی نے مشہور مُؤرّخ اَلبیرُونی سے پُوچھا "میرے پاس دولت بھی ہے اور تلوار بھی۔ میں اِنہیں کیسے اِستعمال کروں؟ اَلبیرُونی نے جواب دیا "دولت سے غریب عوام کی دُعائیں حاصِل کیجیے اور تلوار سے گُناہوں کا خاتمہ کیجیے"۔
○ سکندرِ اعظم سے کسی نے پُوچھا "کیا وجہ ہے کہ آپ اپنے اُستاد کی عِزّت اپنے والِد سے بھی زیادہ کرتے ہیں؟"
سکندرِ اعظم نے جواب دیا "باپ نے میرے جِسم کی اور اُستاد نے میری روح کی پرورش کی ہے۔ جسم فانی ہے اور روح غیر فانی۔ محمّد سعید رضا خاکوانی' بورے والا۔
○ مجلس میں زبان پر' غصّے میں ہاتھ پر' دسترخوان پر بیٹھ کر بھوک پر قابو رکھو تو ہمیشہ پریشانی سے بچے رہو گے۔ (اِمام رازیؒ) ابرانہ کوثر' راول پنڈی۔
○ ہر بات پر ہنسنے والا بے وقوف ہوتا ہے۔
(مولانا ابُوالکلام آزاد)

○ بہت زیادہ بولنے والا اپنی عِزّت کھو بیٹھتا ہے۔ (لُقمان)
○ جسے ہارنے کا خوف ہے' وہ ضرور ہارے گا۔ (نپولین) جبران احمد' پشاور چھاؤنی۔
○ دوسروں کی بُرائیوں پر نظر ڈالنے سے پہلے اپنی بُرائیوں پر نظر ڈال لو۔ (اِمام رازیؒ) عِمرانُ اللہ خان کنڈی' گلشنِ اِقبال کراچی۔
○ جو شخص اپنے بڑوں کی عِزّت نہ کرے' وہ ہم میں سے نہیں ہے۔ (حضُور نبی کریم ﷺ)
○ ظالموں کو مُعاف کرنا' مظلوموں پر ظُلم ہے۔
(حضرت عُمر فاروقؓ)
○ خاموشی غصّے کا بہترین عِلاج ہے۔ (حضرت عُثمان غنیؓ) پرنس ایم سلیم شیخ' بھوَرو۔
○ اِنسان کی قدر و قیمت عِلم کے اِعتبار سے ہوتی ہے۔ (حدیثِ نبویؐ)
○ قبل اِس کے کہ بُزرگ بنو' عِلم حاصل کرو۔ (حضرت عُمر فاروقؓ)
○ دین خزانہ ہے اور عِلم اُس کا راستہ۔ (حضرت علیؓ)
○ عِلم سے محبّت کرنا دانش سے محبّت کرنا ہے۔ (افلاطون)
○ عِلم دل کو اِس طرح زندہ کرتا ہے جس طرح بارش زمین کو۔ (لُقمان حکیم) عِرفان عامِر' طورولی جہلم۔
○ گُناہ کو نہ دیکھو کہ وہ کتنا چھوٹا ہے بلکہ خدا کی بڑائی کو سامنے رکھو جس کی نافرمانی کی جا رہی ہے۔ (ابنِ قیّم)
○ اپنے دُشمنوں سے محبّت رکھو اور اپنے ستانے والوں کے لیے دُعا مانگو کیوں کہ خداوندِ کریم اپنے سورج کو نیک و بد دونوں پر چمکاتا ہے اور اچھّے اور بُرے دونوں پر مینہ برساتا ہے۔ (حضرت عیسیٰ علیہ السّلام)
○ مُصیبت اِنسان بناتی ہے اور مال و دولت شیطان۔ (وِکٹر ہیوگو) عائشہ سوریہ' طارق آباد فیصل آباد۔

کوئی دیکھ رہا ہے

غُلام عبّاس، گاؤں منیانوالہ

یہ اُن دِنوں کا واقعہ ہے جب ہمارے اِسکول میں گرمیوں کی چُھٹیّاں تھیں۔ ہم چار پانچ لڑکے روزانہ گاؤں کے باہر ایک پیڑ کے نیچے بیٹھ کر بارہ بجے تک چُھٹیوں کا کام کرتے تھے۔ وہاں سے کچھ فاصلے پر امرودوں کا ایک باغ تھا۔

ایک دِن جب ہم کام سے فارغ ہوئے تو اکرم نے کہا کیُوں نہ آج باغ سے امرود توڑے جائیں۔ اِس وقت باغ کا مالک سو رہا ہو گا اور گرمی کی وجہ سے کوئی اور آدمی بھی اُدھر نہیں آئے گا"۔ ہم نے اُس کی ہاں میں ہاں مِلائی اور اُس باغ کی طرف روانہ ہوگئے۔

جب ہم باغ کے نزدیک پہنچے تو پہلے اِردگرد دیکھا کہ کوئی شخص ہمیں دیکھ تو نہیں رہا۔ اِس کے بعد باغ کے اندر گئے۔ باغ کا مالک ایک درخت کے سائے میں لیٹا بے خبر سو رہا تھا۔ ہم نے احمد سے کہا کہ تم چھوٹے ہو، اِس لِیے تم باہر جاکر کھڑے ہو جاؤ اور اگر کوئی باغ کی طرف آئے تو زور سے کہنا "کوئی دیکھ رہا ہے"۔ یہ سُنتے ہی ہم درختوں سے اُتر کر دوڑ لگا دیں گے۔ تم بھی ہمارے ساتھ دوڑ لگا دینا"۔ احمد نے کہا، ٹھیک ہے اور وہ باہر چلا گیا۔

ہم درختوں پر چڑھ کر امرود توڑنا ہی چاہتے تھے کہ احمد نے زور سے کہا "کوئی دیکھ رہا ہے!" یہ سُننا تھا کہ ہم سب جلدی جلدی درختوں سے اُترے اور ایک دم دوڑ لگا دی۔ احمد بھی ہمارے ساتھ دوڑ پڑا۔

باغ سے کافی دُور جانے کے بعد ہم نے پیچھے مُڑ کر دیکھا تو دُور دُور تک کوئی شخص نظر نہ آیا۔ ہم رُک گئے اور احمد سے پُوچھا "کون دیکھ رہا تھا؟"

احمد نے کہا "اللہ تعالیٰ دیکھ رہا تھا"

اُس کی یہ بات سُن کر ہم بہُت شرمندہ ہوئے۔ وہ ہم سے چھوٹا تھا۔ مگر اُس نے بات بہُت بڑی کی تھی۔ اُس کی اِس بات کو ہم نے ہمیشہ یاد رکھا اور اِن شاء اللہ آخر دم تک یاد رکھیں گے۔

اُس دن کے بعد امرود تو بڑی بات ہے، ہم نے کسی کا تِنکا تک چوری نہیں کیا، کیوں کہ ہمیں یقین ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر جگہ موجود ہے اور وہ ہمیں دیکھ رہا ہے۔

(پہلا اِنعام: 50 روپے کی کتابیں)

مری کی سیر

محمد نعیم اشرف، ساہیوال

یہ واقعہ پچھلے دسمبر میں ہمارے ساتھ پیش آیا۔

سردیوں کی چُھٹیّاں ہوئیں تو میرے دوستوں نے مری جانے کا پروگرام بنایا اور اُنھوں نے اپنے اپنے گھروں سے پانچ دن کی اِجازت لے لی۔ اُن کو تو اجازت مِل گئی لیکن مجھے نہ ملی۔ میں نے والِد صاحب کی بہُت مِنّت سماجت کی، لیکن اُنھوں نے مجھے اچھی خاصی ڈانٹ پلا کر خاموش کر دیا۔ مگر میں نے بھی عہد کر لیا کہ میں مری ضرور جاؤں گا۔ کیوں

کہ میرے دوستوں نے تفریح کے بہت دل چسپ پروگرام بنائے تھے۔ لہٰذا میں نے طے کیا کہ گھر والوں کو بتائے بغیر ہی چلا جاؤں گا اور مری پہنچ کر اُنھیں ٹیلی فون پر بتا دوں گا۔

منگل کی رات کو ہم سب دوست بسوں کے اڈّے پر گئے اور ٹکٹ خرید کر بس میں بیٹھ گئے۔ ساری رات سفر کرنے کے بعد راول پنڈی پہنچے اور وہاں سے دو ٹیکسیاں کرائے پر لے کر تقریباً آدھ گھنٹے بعد مری پہنچ گئے۔ وہاں سے ہم نے ایک ہوٹل میں پانچ دن کے لیے دو کمرے بُک کرائے۔

اگلے روز ہم نے مری کی خوب صورت پہاڑیوں کی سیر کرنے کا پروگرام بنایا اور تقریباً گیارہ بجے مری کے جنوب میں واقع پہاڑیوں کی طرف روانہ ہوگئے۔ میرے ساتھی تو فوٹو کھینچنے اور اِدھر اُدھر گھومنے پھرنے لگے، اور میں نے ایک پہاڑی پر چڑھنے کا پروگرام بنایا۔ پہاڑی بڑی خطرناک تھی۔ ابھی میں مُشکل سے آدھی پہاڑی پر چڑھا ہوں گا کہ میرا پاؤں پھسل گیا اور میں دھڑام سے نیچے گر گیا۔ میرے مُنہ سے چیخ نکل گئی جس نے سب کو میری طرف مُتوجّہ کرلیا۔ میری ایک ٹانگ ٹوٹ چکی تھی، اور میں بے ہوش ہو گیا تھا۔ دوستوں نے مجھے ہسپتال میں داخل کرا دیا۔

جب میری آنکھ کُھلی تو میرے دوست میرے سامنے بیٹھے مجھے افسوس بھری نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ مجھے بڑا افسوس ہُوا کیوں کہ میری وجہ سے اُن کی تفریح ادھوری رہ گئی تھی۔ اگر میں نے اپنے والد کی بات مانی ہوتی تو میری یہ حالت نہ ہوتی اور دوستوں کے سامنے شرمندہ نہ ہونا پڑتا۔ واقعی مجھ سے بہت بڑی غلطی ہوئی تھی۔

اُسی دن میں نے پکّا اِرادہ کرلیا کہ خواہ کتنا ہی اہم کام کیوں نہ ہو، جب تک والدین اِجازت نہیں دیں گے، میں وہ کام کبھی نہیں کروں گا۔

(دوسرا اِنعام: 45 روپے کی کتابیں)

دھات کا تار

اِمتیاز مقبول، مزنگ لاہور

"عمران بیٹا، نیچے آکر کھانا کھالو" عمران کی امّی نے اُسے آواز دیتے ہوئے کہا۔

"اچھا، امّی جان۔ آ رہا ہوں۔ بس ذرا یہ پتنگ اُڑا لوں" عمران نے جواب دیا۔

بسنت میں دو ہفتے رہ گئے تھے، اور عمران کی خواہش اور کوشش تھی کہ وہ بسنت تک بہت سی پتنگیں جمع کرلے تاکہ خوب جی بھر کے پتنگیں اُڑا سکے۔

اُس روز جمعہ تھا اور وہ صبح ہی سے چھت پر چڑھ گیا تھا تاکہ کٹی ہوئی پتنگیں لُوٹ سکے۔ کھانا کھانے کے بعد وہ چھت پر گیا ہی تھا کہ اُسے گھنٹی کی آواز سُنائی دی۔ اُس نے نیچے جھانک کر دیکھا تو اُس کا جگری دوست عاطف کھڑا تھا۔ وہ اُسے چھت پر لے آیا اور کہنے لگا:

"بھئی عاطف، کوئی ایسی ترکیب بتاؤ کہ ہم زیادہ سے زیادہ پتنگیں جمع کرسکیں"۔

عاطف بولا "ایک ترکیب ہے۔ اگر ہم اپنی پتنگ میں ڈور کے ساتھ تار باندھ لیں تو کٹی ہوئی پتنگیں تار میں اُلجھ جائیں گی اور ہم اُنھیں پکڑ لیں گے"۔

"مگر تُم نے وہ اِعلان نہیں سُنے جو ٹی وی، ریڈیو اور اخبارات کے ذریعے کیے جا رہے ہیں اور جن میں پتنگ اُڑانے کے لیے تار اِستعمال کرنے سے منع کیا گیا ہے؟" عمران بولا۔

"وہ تو ٹھیک ہے، مگر ہم احتیاط سے پتنگ اُڑائیں گے۔ اور پھر تمھاری چھت کے پاس تو بجلی کے کھمبے ہیں ہی نہیں" عاطف نے کہا۔

"کہیں امّی ناراض نہ ہوں" عمران بولا۔

"ہم کسی کو بتائیں گے ہی نہیں" عاطف نے کہا۔

تھوڑی سی بحث کے بعد عمران راضی ہوگیا۔ عاطف اپنے گھر سے تار کا ٹکڑا لے آیا اور وہ اُسے ڈور کے ساتھ

باندھ کر پتنگ اُڑانے لگے۔ اُنھیں پتنگ اُڑاتے کچھ ہی دیر ہوئی تھی کہ اچانک عمران کے ہاتھ سے ڈور کا سرا نکل گیا اور اُن کی پتنگ گلی کے پار ایک گھر کی چھت پر کھڑے ہوئے بچّوں نے پکڑ لی اور وہ آپس میں چھینا جھپٹی کرنے لگے۔ اُس گھر کے پاس ہی بجلی کا کھمبا تھا۔ اِس چھینا جھپٹی میں پتنگ سے بندھا تار کا ٹکڑا بجلی کے کھمبے سے ٹکرایا تو زور دار دھماکا ہُوا اور جس بچّے کے ہاتھ میں اُس تار کا دوسرا سرا تھا، وہ بجلی کا جھٹکا لگنے سے بے ہوش ہوگیا۔ اِس کے ساتھ ہی سارے عِلاقے کی بجلی بند ہوگئی۔

عمران اور عاطف نیچے اُتر کر اُس گھر کے پاس گئے تو وہاں کہرام مچا ہوا تھا۔ لوگ اُس بچّے کو ہسپتال لے جا رہے تھے۔ ایک شخص کہہ رہا تھا کہ اگر بچّے نے پاؤں میں پلاسٹک کی چپّل نہ پہنی ہوتی تو اُس کی جان جا سکتی تھی۔

شام کو اُن کا سارا محلّہ تاریکی میں ڈُوبا ہوا تھا۔ معلوم کرنے پر پتا چلا کہ محلّے کا ٹرانسفارمر جل گیا ہے اور اُسے تبدیل کرنے میں کم از کم دو دِن لگیں گے۔ وہ دونوں اپنے کیے پر بہت شرمندہ ہوئے اور عہد کیا کہ آیندہ کبھی پتنگ اُڑانے کے لیے تار اِستعمال نہیں کریں گے اور اپنے دوستوں کو بھی ایسا کرنے سے منع کریں گے۔

ساتھیو، اگر آپ میں سے کوئی پتنگ بازی کا شوقین ہے تو اُسے چاہیے کہ تار اِستعمال نہ کرے، کیوں کہ ایسا کرنا جان لیوا ثابت ہو سکتا ہے۔

(تیسرا اِنعام: 40 روپے کی کتابیں)

...اور ہم جیت گئے

خالدہ اِعجاز، راول پنڈی

یہ اُس وقت کی بات ہے جب ہم پانچویں جماعت میں پڑھتے تھے۔ ہم اپنے گھر میں سب سے چھوٹے تھے اور یہ تو آپ کو پتا ہی ہے کہ سب سے چھوٹے بچّے کو بہت زیادہ پیار دیا جاتا ہے۔ بس یہی حال ہمارا بھی تھا۔ امّی، ابّو، بھائی، بہنیں سب ہمیں بہت چاہتے تھے اور ہماری ہر خواہش پوری کی جاتی تھی۔

بچّے لاڈ پیار سے بگڑ جاتے ہیں۔ لیکن ہم میں ایسی کوئی عادت نہ تھی۔ مگر ہم بھی آخر اِنسان تھے۔ ایک مرتبہ کا ذکر سُنیے۔ گرمیوں کے دِن تھے، اور یہ دِن بڑے مزے کے ہوتے ہیں۔ جی ہاں، آم جو کھانے کو ملتے ہیں۔ چُناں چہ ہمارے بھی بڑے عیش تھے، کیوں کہ ہمیں ہر روز آم کھانے کو ملتے تھے۔

زیادہ مزا تو اُس وقت آتا تھا جب کھٹّی کھٹّی کیریوں کو خوب نمک مرچ لگا کر کھاتے تھے۔

ایک دن کیا ہُوا، امّی بازار سے آئیں تو ڈھیر ساری کیریاں لے آئیں۔ ہم بڑے خوش ہوئے۔ جلدی جلدی موٹی موٹی کیریاں چُن کر الگ کرنے لگے۔

"ارے، ارے۔ یہ تم کیا کر رہی ہو؟" امّی نے جلدی سے ساری کیریاں ہمارے ہاتھ سے لے لیں۔

"کیوں، امّی؟" ہم نے مُنہ بناتے ہوئے کہا۔

"بیٹی، یہ کیریاں میں اچار ڈالنے کے لیے لائی ہوں" امّی نے ہمیں پیار سے سمجھایا اور جب امّی ہمیں کوئی بات پیار سے سمجھا دیتیں تو ہم ضِد بالکُل نہیں کرتے تھے۔ امّی نے کیریاں دھو کر اُن کے چار چار ٹکڑے کیے اور اُنھیں باہر دھوپ میں سُکھانے کے لیے رکھ دیا۔

کیا بتائیں، سارے گھر میں کھٹّی کھٹّی خوش بو پھیلی ہوئی تھی جو ناک کے راستے ہمارے دل تک اُتری جا رہی تھی۔ دل چاہ رہا تھا کہ زیادہ نہ سہی، صرف ایک ٹکڑا ہی کھالیں۔ امّی دوپہر کا کھانا پکانے کچن میں گئیں اور اُنھوں نے ہمیں آواز دے کر کہا "گُڑیا، آنگن میں جاکر کیریوں کے ٹکڑوں کو پلٹتی رہنا تاکہ سب طرف دھوپ لگ جائے"

ہم جلدی سے آنگن میں گئے اور چارپائی کے قریب

کرسی ڈال کر بیٹھ گئے۔ ہمارا دل کیریوں کو دیکھ کر زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ شیطان بھی ہمیں اُکسا رہا تھا اور ہم دل میں سوچ رہے تھے کہ کیا فرق پڑ جائے گا اگر ہم ایک آدھ ٹکڑا چکھ لیں گے۔ امّی تو کچن میں مصروف ہیں اور ویسے بھی اُنھوں نے سارے ٹکڑے گِن کر تھوڑے ہی رکھے ہیں۔

یہ سوچ کر ہم نے ایک موٹے سے ٹکڑے کی طرف ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ ہمارے دل کی دھڑکن جو اُس وقت 100 کلومیٹر فی منٹ کی رفتار سے چل رہی تھی، ایک دم تھم گئی۔ اُسی وقت ہمارے اندر سے ایک آواز آئی کہ اگر تمھاری امّی تمھیں نہیں دیکھ رہیں تو اللہ میاں تو دیکھ رہے ہیں۔ ایک تو تم چوری کر رہی ہو اور دوسرے ماں کی نافرمانی کر رہی ہو۔ یہ ہمارے ضمیر کی آواز تھی۔

اب ہماری اور شیطان کی جنگ چھڑ گئی۔ ہم بار بار کیریوں کی طرف ہاتھ بڑھاتے اور ہمارا ضمیر فوراً ہمیں ٹوک دیتا۔ آخر کار ضمیر جیت گیا اور شیطان ایسا دُم دبا کر بھاگا کہ پلٹ کر بھی نہ دیکھا۔ اُس وقت ہمیں اِتنی خوشی ہوئی کہ بیان سے باہر ہے۔

ہم زور زور سے اُچھلنے کودنے لگے اور ساتھ ہی نعرے بھی لگانے لگے "ہپ ہپ ہُرّے! ہم جیت گئے! ہم جیت گئے!"

ہم اِسی طرح اُچھل کود کر رہے تھے کہ اچانک کسی کی نرم اور مہربان بانہوں نے ہمیں اپنی آغوش میں لے لیا۔ مُڑ کر دیکھا تو ہماری امّی تھیں۔ وہ ایک گھنٹے سے باورچی خانے کے دروازے کی اوٹ سے ہماری یہ کارروائی دیکھ رہی تھیں۔ وہ ہماری اِیمان داری سے بہُت خوش تھیں اور انھیں ہم پر بہُت پیار آ رہا تھا۔ اور جب امّی کو پیار آتا ہے تو اِنعام بھی ملتا ہے۔ وہ اِنعام پتا ہے کیا تھا؟ اُنھوں نے ایک کے بجائے کیری کے دو موٹے موٹے ٹکڑے ہمیں دِیے جو ہم نے خوب مزے لے لے کر کھائے۔

ہم سچ کہتے ہیں کہ اِس سے پہلے کیریاں کھانے کا اِتنا مزا کبھی نہیں آیا تھا۔ (چوتھا اِنعام: 35 روپے کی کتابیں۔ خالِدہ اعجاز اپنا پُورا پتا لکھیں)۔

ایسی جلدی بھی کیا

حلیمہ بشیر، بہاول پور

میں چوتھی جماعت میں پڑھتی ہوں۔ ایک روز میں اپنی سہیلی، نورین، کے ساتھ اِسکول سے گھر واپس آ رہی تھی۔ راستے میں ایک چوراہا پڑتا ہے، جسے پار کر کے ہم اپنے گھر جاتے ہیں۔

جب ہم چوراہے پر پہنچے تو بڑی سڑک کی ٹریفک چل رہی تھی اور چھوٹی سڑک کی، جہاں ہم کھڑے تھے، بند تھی۔ میں نے دیکھا کہ نورین سڑک پار کرنے کے لیے پر تول رہی ہے۔ اُس کی عادت ہے کہ وہ ہر کام میں جلدی کرتی ہے ، سڑک پار کرنے کے لیے ٹریفک رُکنے کا بھی اِنتظار نہیں کرتی اور گاڑیوں کے آگے سے بھاگ کر گزر جاتی ہے۔ بعض وقت تو ایسا ہوتا ہے کہ ڈرائیوروں کو اُسے بچانے کے لیے ایمرجنسی بریک لگانا پڑتے ہیں۔

خیر، اُس دن بھی میں تو ٹریفک رُکنے کا اِنتظار کرنے لگی، لیکن نورین ایک دم دوڑ پڑی۔ دائیں طرف سے ایک منی بس بڑی تیزی سے آ رہی تھی۔ نورین نے اُس کے آگے سے گزرنا چاہا تو پیچھے سے کسی نے اُس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ یہ ہماری مِس صائمہ تھیں۔ اگر وہ ایک سیکنڈ کی دیر کر دیتیں تو نورین بس کے نیچے آجاتی۔

جب دائیں طرف کی ٹریفک بند ہوگئی اور سامنے کی سبز بتّی جلی تو ہم نے سڑک پار کی۔ مِس نے نورین کو خوب ڈانٹا۔ اُنھوں نے کہا "دو منٹ دیر سے گھر پہنچنا ہسپتال میں ایک ہفتہ گزارنے سے بہتر ہے۔ ہمیں ٹریفک کے اُصولوں کی پابندی کرنا چاہیے۔ اِسی میں ہماری بھلائی ہے"۔

(پانچواں اِنعام: 25 روپے کی کتابیں)

نزہت شاہ جہان پوری

تتلیاں

رنگ برنگی تتلیاں پیاری باغوں کی ہیں راج دُلاری
ننّھی ننّھی ، پریاں جیسے رنگ نکھاریں ، کیسے کیسے
باغوں باغوں ، اِن کے پھیرے پھولوں پھولوں ، اِن کے ڈیرے
پھولوں پھولوں ، اُڑتی جائیں کلیوں کا یہ جی للچائیں
اِن کے پروں پر نقش بنے ہیں
کیسے کیسے رنگ سجے ہیں
پھول کی زینت' باغ کی زینت رنگ بکھیرے ' اِن کی رنگت
سُندر سُندر سب کی پیاری ہر تتلی ہے راج کُماری
پیار سے جینا سب کو سکھائیں یہ نہ کسی کے دِل کو دُکھائیں
اِن سے سیکھو پیار سے رہنا دیکھو' اِن کو کچھ نہ کہنا
اِن کو نہ پکڑو ، اِن کو نہ دُکھ دو
جینے کا تُم اِن سے سبق لو

چچا بھلکڑ گئے سسرال

ذکیہ بلگرامی

"ارے، میں نے کہا، سنتے ہیں؟" حمیرا نے میاں کے قریب آکر کہا۔

چچا بھلکڑ کسی سوچ میں گم تھے۔ چونک پڑے۔ بولے "کیا کہا؟ لاحول ولا قوۃ!"

"ارے! اس میں لاحول پڑھنے کی کیا بات ہے؟"

"میں کچھ سوچ رہا تھا، ایک انتہائی ضروری بات۔ تم نے سب کچھ بھلا دیا"۔

"تو پھر آپ بھولی ہوئی بات سوچیے، میں جا رہی ہوں" حمیرا جانے لگی۔

"اچھا، کہو۔ کیا کہہ رہی تھیں؟" چچا نے پوچھا۔

"میں یہ کہہ رہی تھی کہ آپ کچھ دنوں کے لیے ماموں جان کے پاس ہو آیئے۔ وہ لوگ کئی بار بلا چکے ہیں۔ ممانی سے تو آپ اب تک ملے ہی نہیں"۔ حمیرا نے کہا۔

"آنے جانے میں خاصا خرچہ ہو گا" چچا بولے۔

"حیدر آباد ہے ہی کتنی دور۔ اور پھر آپ بھول گئے شاید کہ اب آپ غریب نہیں ہیں۔ پانچ لاکھ کا انعام نکلا ہے آپ کا"۔

"ارے ہاں! میں واقعی بھول گیا تھا۔ مگر......" چچا کچھ کہتے کہتے رک گئے۔

"اگر مگر کچھ نہیں۔ آپ کل ہی چلے جایئے، دو تین روز کے لیے۔ پچھلے ماہ ممانی جان کراچی آئی تھیں تو میرے گھر بھی آئی تھیں۔ آپ دفتر میں تھے، اس لیے ملاقات نہ ہو سکی"۔

"اچھا، ٹھیک ہے۔ جیسا تم کہو"۔

"اور ہاں، میں جو آپ کے لیے چار جوڑے خرید کر لائی تھی، وہ اب تک آپ نے نہیں پہنے۔ انہیں ساتھ لے جایئے گا۔ اس کے علاوہ----"

"اس کے علاوہ کیا؟" چچا نے پوچھا۔

"دراصل میں نے کبھی کسی کو کچھ دیا نہیں۔ ممانی کے لیے ایک شال لائی ہوں اور ان کی دونوں لڑکیوں کے لیے ریشمی سوٹ کا کپڑا خریدا ہے۔ وہ انہیں دے آیئے گا" حمیرا نے کہا

"خیر، یہ تو تم نے اچھا کیا" چچا بھلکڑ خوش ہو گئے۔

"اچھا تو میں آپ کا سامان تیار کر دیتی ہوں" یہ کہہ کر حمیرا دوسرے کمرے میں چلی گئی۔

وہ بہت خوش تھی کیوں کہ اسے یقین نہ تھا کہ اس

کے میاں اِتنی آسانی سے اُس کی بات مان جائیں گے۔ اُسے اپنے ماموں سے بہت مُحبّت تھی اور وہ بھی اُسے بہت چاہتے تھے۔ وہ جب بھی کراچی آتے، کچھ دیر کو اُس کے گھر ضرور آتے۔

دوسرے روز چچا بھلکڑ حیدر آباد روانہ ہوگئے۔ حمیرا نے پتا لکھ کر دے دیا تھا اور اچھّی طرح سمجھا بھی دیا تھا۔ اُس کے ماموں ڈاکٹر تھے اور اُن کی پریکٹس بہت اچھّی چلتی تھی۔ اُن کا نام عبدُالحکیم تھا۔ یہ تمام باتیں چچا بھلکڑ نے گِرہ میں باندھ لی تھیں۔

چچا بھلکڑ نے حیدر آباد کے اِسٹیشن پر اُتر کر جیب میں ہاتھ ڈالا تو ماموں کا پتا غائب۔ خدا جانے کہاں رکھ کر بھول گئے تھے۔ کچھ پریشانی تو ہُوئی مگر پھر مُطمئِن ہوگئے کہ محلّہ تو معلوم ہی ہے۔ جب وہ اُس محلّے میں پہنچے تو سامنے ہی ایک ہوٹل تھا۔ چچا کو بھوک لگی تھی۔ ہوٹل میں بیٹھ کر چائے پی اور پھر اُس کے مالِک سے ماموں حکیم کے بارے میں دریافت کیا۔

"آپ حکیم صاحِب کا پتا پُوچھ رہے ہیں ناں؟" ہوٹل کے مالِک نے پوچھا۔

"جی ہاں۔ وہ حکیم ہیں۔ اُن کے مطب پر بہت رش ہوتا ہے" چچا بھلکڑ نے جلدی سے کہا۔ وہ یہ بھول گئے کہ حُمیرا کے ماموں کا نام عبدُالحکیم ہے، اور وہ حکیم نہیں، ڈاکٹر ہیں۔

"ہاں۔ اللہ نے اُن کے ہاتھ میں بڑی شِفا دی ہے۔ بہت نام ور حکیم ہیں۔ مگر آج کل وہ شہر سے باہر گئے ہوئے ہیں" ہوٹل کا مالک بولا۔

"کوئی بات نہیں گھر میں اور لوگ تو ہوں گے" چچا نے کہا۔

"ہاں، ہاں، کیوں نہیں" ہوٹل والا بولا "ارے چھوٹے! اِدھر آ ذرا۔ اِن صاحِب کو حکیم صاحِب کے گھر تک چھوڑ آ۔ یہ اُن کے مہمان ہیں"۔

چھوٹا چچا بھلکڑ کو حکیم صاحِب کے گھر پہنچا کر واپس چلا گیا۔ چچا نے گھنٹی بجائی تو کسی خاتون نے دروازہ کھولا اور چہرہ نکالے بغیر اندر سے سوال کیا "کون ہے؟"

"میں کراچی سے آیا ہُوں، حکیم ماموں کے پاس۔ بیگم نے بھیجا ہے"۔ چچا نے جواب دیا۔

"اچھا، اچھا۔ بیگم نے بھیجا ہے۔ آپ ذرا ٹھہریے"۔ اُس خاتون نے کہا، اور اِس کے ساتھ ہی گھر کے اندر ہل چل مچ گئی۔

تھوڑی دیر بعد ایک مُلازِم لڑکا نکل کر آیا اور اُس نے چچا کو ایک کمرے میں لے جاکر بٹھا دیا۔

کمرا بہت سجا سجایا تھا۔ چچا یہ سوچ کر بے حد خوش ہوئے کہ یہاں اُن کی خوب خاطِر مُدارات ہوگی۔ وہ کھانے پینے کے ہمیشہ سے شوقین تھے۔

تھوڑی دیر بعد ایک خاتون جو شاید حکیم صاحِب کی بیوی تھیں، اندر آئیں۔ پھر چائے اور کھانے پینے کا سامان آگیا۔ چچا نے عادت کے مُطابِق خوب ڈٹ کر کھایا۔

"حکیم ماموں کہاں ہیں؟" چائے کے بعد اُنھوں نے

ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے پُوچھا۔
"وہ میرپور خاص گئے ہیں۔ کل دوپہر تک آجائیں گے۔ آپ اطمینان سے رہیں اور تکلّف بالکل نہ کریں۔ ہاں، اپنی پسند بتا دیں۔ رات کے کھانے میں کیا کھائیں گے؟"
"آپ تکلّف نہ کریں۔ مجھے تو سارے کھانے ہی پسند ہیں۔ مُرغ پُلاؤ، کوفتے، بریانی، کباب، نہاری کوئی بھی چیز پکوالیں"۔
"اچھا ٹھیک ہے۔ آپ آرام کریں۔ میں ابھی آتی ہُوں" یہ کہہ کر وہ خاتون اندر چلی گئیں۔
حکیم صاحب اُس محلّے کے ایک عزّت دار اور کھاتے پیتے آدمی تھے۔ اُن کی دو بیٹیاں تھیں۔ وہ بڑی بیٹی جمیلہ کی شادی کرنا چاہتے تھے، لیکن حیدر آباد میں کوئی اچھا رشتہ نہیں مِل رہا تھا۔ اُن کی ایک بھانجی کراچی میں رہتی تھی، جس کا نام بیگم تھا۔ حکیم صاحب نے بیگم سے کہہ رکھا تھا کہ وہ کراچی کے کسی اچھے گھرانے میں جمیلہ کا رِشتہ کرادے۔
ابھی چند روز پہلے حکیم صاحب کی بیوی کے نام بیگم کا خط آیا تھا کہ اُسے ایک لڑکا پسند آیا ہے۔ وہ سرکاری مُلازم ہے اور چند روز میں، اپنے کسی رشتے دار سے ملنے کے لیے، حیدر آباد جانے والا ہے۔ میں اُس کے ہاتھ آپ کی لڑکیوں کے لیے سُوٹ کا کپڑا بھیجوں گی۔ اِس بہانے آپ لڑکے کو دیکھ لینا۔ اگر آپ نے ہاں کر دی تو پھر اُس کی ماں سے بات کروں گی۔
حکیم صاحب کی بیوی نے اندر جاکر اپنی چچی سے کہا "چچی امّاں، بیگم نے کراچی سے لڑکا بھیجا ہے۔ مگر دیکھنے میں بونگا سا لگتا ہے"۔
"اری بیٹی، لڑکے کی سیرت دیکھتے ہیں، صورت نہیں۔ اگر وہ شریف اور کماؤ پُوت ہے تو بس ٹھیک ہے" چچی جان نے کہا۔
"حکیم صاحب کو بھی ابھی جانا رہ گیا تھا۔ وہ ہوتے تو کچھ بات چیت کرتے" بیوی نے کہا۔
چچی بولیں "وہ کل آجائیں گے۔ کل تک کے لیے لڑکے کو روک لو"۔
"چچی جان، آپ بھی کمال کرتی ہیں۔ ایک غیر مرد کو اپنے گھر میں کیسے ٹھہراؤں؟" بیوی نے کہا۔
"اُسے رات کو شبّن کے کمرے میں سُلا دینا۔ ایک دن ہی کی تو بات ہے" چچی بولیں۔
شبّن حکیم صاحب کے ایک دُور کے رشتے دار، "بُدّن میاں" کا لڑکا تھا۔ بُدّن میاں گاؤں میں رہتے تھے۔ شبّن حیدر آباد کے ایک کالج میں پڑھتا تھا۔ حکیم صاحب نے اُسے اپنے گھر کے قریب ایک کمرا کرائے پر دِلوا دیا تھا۔
"آپ نے یہ بات تو ٹھیک کہی" بیوی نے کہا۔
"رات کے کھانے میں کیا پکوا رہی ہو؟" چچی نے پُوچھا۔
"مجھے تو لڑکا چٹورا لگتا ہے۔ کباب، کوفتے، بریانی سب ہی چیزوں کے نام گِنوا دیے"۔
"چلو، کوئی بات نہیں۔ لڑکا چٹورا ہے تو اچھا ہے۔ اپنی جمیلہ کا نصیب کُھل جائے گا۔ ہاں، یہ تو معلوم کرو جاکر کہ لڑکا کرتا کیا ہے۔ کتنے بہن بھائی ہی ہیں"۔
"ابھی جاتی ہُوں" حکیم صاحب کی بیگم چچا کے کمرے میں گئیں تو وہ آرام سے ترچھے ترچھے لیٹے تھے۔ ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھے۔
"ارے میاں صاحب زادے، تُم نے یہ تو بتایا ہی نہیں کہ کتنے بہن بھائی ہو اور نوکری کہاں کرتے ہو؟"
"میرا کوئی بہن بھائی نہیں ہے۔ اکیلا ہُوں" چچا بولے
"اچھا خیر، نوکری کہاں کرتے ہو؟"
"سرکاری مُلازمت ہے۔ تنخواہ کم ہے۔ مگر آپ کو ایک خوش خبری سُنانی ہے۔ بیگم نے ابھی کسی کو نہیں بتایا"۔
"ہاں ہاں، ضرور سُناؤ" حکیم صاحب کی بیوی نے کہا۔
"میرا پانچ لاکھ کا بانڈ نِکلا ہے۔ بس یُوں سمجھیں کہ سارے دِلدّر دُور ہوگئے ہیں"۔
"ارے! واقعی؟ یہ تو بہُت ہی بڑی خوش خبری ہے" حکیم صاحب کی بیوی جھُوم کر بولیں اور جلدی سے واپس اندر چلی گئیں۔

ذرا سی دیر میں پانچ لاکھ کے اِنعام کی بات گھر بھر میں پھیل گئی۔ پہلے جو لڑکا بہت معمولی نظر آ رہا تھا، اچانک خوب صورت دکھائی دینے لگا۔

اب طے یہ پایا کہ مہمان کی ہر طرح سے خاطِر تواضُع کی جائے۔ کوئی کسر نہ چھوڑی جائے۔ بیگم نے بہت سوچ سمجھ کر رِشتے کی بات چلائی ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو یہ رِشتہ ہاتھ سے چلا جائے۔

رات کا کھانا اِتنا شان دار تھا کہ چچا بھلکڑ حیران رہ گئے۔ اُنھوں نے خوب خوب کھایا۔ حکیم صاحِب کی بیوی نے یہ بہانہ کر کے کہ گھر میں بہت سے مہمان آئے ہوئے ہیں، چچا کو شبّن کے کمرے میں سُلا دیا۔ چچا کو بھلا کیا اِعتراض ہو سکتا تھا۔ اُنھیں تو حلوا پُوری، کوفتے، کباب اور مُرغ پُلاؤ سے غرض تھی۔

دوسرے دن، دوپہر کے کھانے کے بعد، چچا بُھلکڑ نے حکیم صاحِب کی بیوی سے کہا "حکیم ماموں تو آئے نہیں۔ اب کراچی واپس جا رہا ہوں"۔

"ارے نہیں، بیٹا۔ ابھی رُکو۔ وہ شام تک آ جائیں گے"۔

دراصل چچا بھلکڑ بیٹھے بیٹھے گھبرا گئے تھے۔ اگرچہ کھانے پینے کو خوب مِل رہا تھا، مگر وہ ایسے آدمی نہ تھے کہ ایک جگہ ٹِک کر بیٹھ سکیں۔ اُنھیں سردی بھی بہت لگتی تھی۔ اُن کے والِد مرحُوم کا ایک لمبا کوٹ اُن کے پاس تھا، جو وہ پوری سردیوں بدن پر چڑھائے رکھتے تھے۔ حیدر آباد میں کراچی سے زیادہ سردی تھی۔ چچا اگرچہ دو سوئٹر پہن کر آئے تھے، پھر بھی اُنھیں سردی لگ رہی تھی۔ اِس لیے اُنھوں نے وُہی پُرانے زمانے کا لمبا کوٹ نکال کر پہن لیا تھا۔ سر پر اُونی ٹوپی بھی مڑھ لی تھی۔

حکیم صاحِب کی بیوی نے اپنی بچی سے کہا "اِتنی سردی ہے تو نہیں جتنی اِس لڑکے کو لگ رہی ہے۔ دیکھو تو، کیا حُلیہ بنا رکھا ہے!"

سہ پہر کو، چائے کے بعد، چچا بُھلکڑ نے حکیم صاحِب کی بیوی سے کہا "لڑکیاں کہاں ہیں؟ وہ مُجھ سے ملنے کیوں نہیں آئیں؟ بیگم تو اُن کی بہت تعریف کرتی تھیں"۔

حکیم صاحِب کی بیوی سٹ پٹا کر بولیں "ہاں، ہاں۔ وہ بھی آ جائیں گی"۔ پھر کچھ سوچ کر اُنھوں نے چھوٹی لڑکی کو اندر بُلا لیا۔ چچا نے اپنا بکس کھولا اور سُوتوں کا کپڑا نکال کر لڑکی کو دے دیا۔

شام کو حکیم صاحِب آ گئے۔ چچا شبّن کے کمرے میں آرام کر رہے تھے۔ حکیم صاحِب کی بیگم نے کسی کو بھیج کر اُنھیں بُلا لیا۔ چچا کمرے میں آ کر بیٹھ گئے۔ اب جو حکیم صاحِب نے اندر کمرے میں قدم رکھا تو چچا بھلکڑ اُنھیں دیکھ کر چونک اُٹھے۔ اُنھیں پتا چل گیا کہ وہ غلط جگہ آ گئے ہیں۔

"اجی حضرت، آپ کون ہیں اور اِس طرح کسی کے گھر میں آنے کی جُرأت کیوں کر ہوئی؟" حکیم صاحِب سخت غصّے میں تھے۔ اُن کی بیوی بھی حواس باختہ سی پاس کھڑی تھیں۔

"یقین کیجیے، میں ایک شریف آدمی ہوں۔ حکیم ماموں کا پتا کھو گیا تھا۔ مجھے ہوٹل والے نے آپ کے گھر پہنچا دیا"

چچا بھلکڑ گھبرا کر بولے۔

"غضب خدا کا! نہ جان نہ پہچان، ایک غیر مرد ہمارے گھر میں دو دِن سے رہ رہا ہے، اور اِس گھر کی عورتوں کی عقل پر پتھر پڑ گئے ہیں۔ اجی حضرت، آپ جو کوئی بھی ہیں، فوراً یہاں سے نو دو گیارہ ہو جائیں"۔

چچا نے جلدی جلدی اپنا سامان سمیٹا۔ وہ لمبا کوٹ پہنے ہوئے تھے اور اُونی ٹوپی بھی کانوں تک مڑھ رکھی تھی۔ جلدی میں دو رنگ کے موزے پہن لیے تھے۔ ایک پاؤں میں سُرخ، دُوسرے میں نیلا۔

جب وہ باہر جانے لگے تو حکیم صاحِب نے کہا "اور یہ میری بھانجی بیگم کے بارے میں تمہیں کیسے عِلم ہوگیا جو تُم فراڈ کرنے یہاں آگئے؟"

"دیکھیے حضرت! میں کوئی فراڈ آدمی نہیں ہُوں" چچا کو غُصّہ آگیا "میں اپنی بیوی کا نام نہیں لیتا، اُنہیں بیگم کہتا ہُوں، اور اُنہی کے ماموں کے گھر آیا تھا"۔

"اچھا، جائیں، دفع ہو جائیں یہاں سے" حکیم صاحِب غُرائے۔

چچا اپنا غصّہ دبائے بسوں کے اڈّے پر آئے اور کراچی جانے والی بس میں سوار ہوگئے۔ راستے بھر یہی سوچتے جا رہے تھے کہ بیگم کو کُچھ نہیں بتائیں گے۔ واقعی بڑی بھول ہوگئی، اور بڑے میاں نے اچھّی خاصی بے عِزّتی بھی کر دی۔ حمیرا پُوچھے گی تو مُمانی اور بچّیوں کی تعریف کر دیں گے وغیرہ وغیرہ۔

جب وہ گھر میں داخل ہوئے تو حُمیرا پریشان بیٹھی تھی۔

"کیوں بھئی، تم کو کیا ہُوا؟ پریشان کیوں ہو؟" چچا نے پُوچھا۔

"آپ کی وجہ سے پریشان تھی۔ خدا کا شکر کہ آپ ساتھ خیریّت کے واپس آگئے"۔

"لیکن اِس میں پریشان ہونے کی کیا بات ہے؟ دو دِن رہ کر آیا ہُوں، تمہارے ماموں جان کے گھر۔ اِتنے زیادہ دِن تو نہیں ہوگئے کہ تُم پریشان ہو جاؤ"۔

"ماموں جان کے گھر؟" حُمیرا نے پُوچھا۔

"کیوں؟ تمہیں شک ہے کیا؟" چچا بولے۔

"یا اللہ! کِس کے گھر رہ کر آگئے؟ ماموں کی فیملی تو دو دِن سے ہمارے گھر آئی ہُوئی ہے" حمیرا نے ماتھے پر ہاتھ مار کر کہا۔

ابھی حمیرا کی بات مُنہ ہی میں تھی کہ ماموں، ممانی اور اُن کی دونوں لڑکیاں دُوسرے کمرے سے نکل کر آگئیں۔

اب کچھ چُھپانا فضول تھا۔ چچا نے سب کچھ سچ سچ بتا دیا۔ ماموں اور ممانی اُن کی داستان سُن کر دِل کھول کر ہنسے۔

"ممانی جان، میں نے آپ کے لِیے ایک بہت اچھی اُونی شال اور بچیوں کے لِیے سُوٹ کے کپڑے خریدے تھے۔ وہ بھی یہ دے آئے ہوں گے" حُمیرا نے افسوس سے کہا۔

"سُوٹ کے کپڑے تو میں نے اُنہیں دے دِیے تھے مگر شال دینا بُھول گیا تھا" چچا نے بڑے فخر سے کہا۔ حُمیرا نے اُن کی بھول پر شکر ادا کیا اور شال مُمانی کو دے دی۔

اِس واقعے کو کئی روز گزر چکے ہیں مگر چچا بُھلکڑ اب بھی رات کی تنہائی میں حیدر آباد کے لذیذ کھانوں کو یاد کیا کرتے ہیں!

بیرسٹر شمشاد نے نئی کوٹھی تعمیر کی تو اِس خوشی میں رشتے داروں اور دوستوں کو ایک شان دار پارٹی دی۔ اِس دعوت میں سُراغ رساں اِنسپکٹر سعید بھی مدعُو تھا۔

پارٹی کے دوران میں، انسپکٹر نے محسوس کیا کہ وسیم صاحِب کچھ پریشان سے ہیں۔ وجہ دریافت کی تو اُنھوں نے کہا "ابھی، تھوڑی دیر پہلے، میرے ہاتھ سے چمچہ گر پڑا۔ میں اُسے اُٹھانے کے لیے جُھکا تو کوٹ کی جیب سے فاؤنٹن پن نکل کر فرش پر گر گیا۔ اُٹھا کر دیکھا تو وہ لیک کر رہا تھا۔ میں اُسے اپنے کمرے میں رکھنے جا رہا تھا کہ ملک اللہ داد صاحِب تشریف لے آئے۔ فاؤنٹن پن میز پر رکھ کر میں اُن کے اِستقبال کے لیے دروازے پر گیا، اور جب واپس آیا تو پن غائب تھا!"۔

"چلیے، چھوڑیے۔ سو ڈیڑھ سو کے قلم کی حقیقت ہی کیا ہے" اِنسپکٹر نے کہا۔

"سو ڈیڑھ سو کا نہیں، جناب" وسیم صاحِب بولے "ایک لاکھ 70 ہزار روپے کا ہے۔ پچھلے سال ایک عرب شیخ نے مجھے تُحفتہً دیا تھا"۔

"ہُوں" اِنسپکٹر بولا "یہ سارے عزّت دار لوگ ہیں۔ اِن کی تلاشی لینا، اپنی عزّت گنْوانا ہے۔ لیکن خیر، آپ مجھے 15 مِنٹ دیجیے"۔ ٹھیک پندرہ مِنٹ بعد اِنسپکٹر وسیم صاحِب کے پاس گیا اور بولا "وہ صاحِب کون ہیں؟ وہ فرنچ کٹ داڑھی والے، عینک لگائے ہوئے؟"

"یہ پراپرٹی ڈیلر ہے۔ اِسی کے ذریعے میں نے اِس کوٹھی کا پلاٹ خریدا تھا"۔ وسیم صاحِب نے بتایا۔

اِنسپکٹر وسیم صاحِب کو ایک کونے میں لے گیا، اِشارے سے پراپرٹی ڈیلر کو بُلایا اور پھر اُس کی جیب میں سے فاؤنٹن پن نکال کر وسیم صاحِب سے بولا "لیجیے، یہ رہا آپ کا قلم!"

بتائیے، اِنسپکٹر نے یہ کیسے معلوم کیا کہ پراپرٹی ڈیلر ہی مُجرِم ہے؟ صحیح جواب دینے والے ساتھی کو 500 روپے کی کتابیں دی جائیں گی۔ کوپن اور فروری کے "مُجرم کون" کا صحیح جواب صفحہ 55 پر دیکھیے۔

R. L. No. 4756

The Taleem-o-Tarbiat, Lahore

PAKISTAN'S MOST WIDELY READ URDU MAGAZINE FOR CHILDREN OF ALL AGES

Price Rs. 12.00

FEROZSONS PRIMARY SCIENCE

FEROZSONS EDUCATIONAL

…IMARY SCIENCE is a complete series of twelve …ded books, well suited to the educational needs of … Medium Schools worldwide.
…ies is to present the fundamentals of science in a w… …ich children can easily understand and assimilate. They will no… only remember the facts but also remember that the learning of th… m was a joyful experience.
Ea… h book is divided into a number of parts which cover the main ar… as of study and are colour-coded for easy reference.
All the books are richly illustrated in colour and each drawing has be… n specially chosen to complement and support the text.
Ea… h book commences with an interest-stimulating quiz and ends wi… an extra-curricular exercise entitled 'Do You Know?'

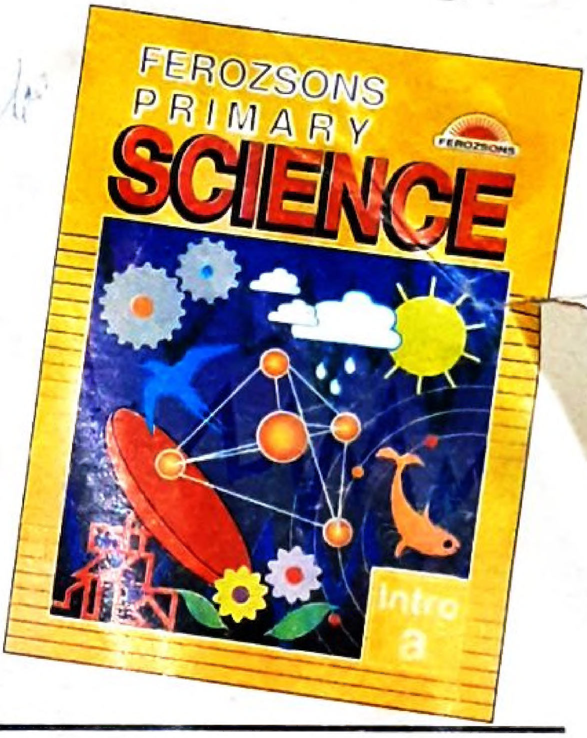

Intro a — 969 … 0141 2, Rs. 35.00
Part 1 Human beings
Part 2 Healthcare and safety
Part 3 Living and non-living things
Part 4 Animals
Part 5 Objects

1a — 969 0 10092 0, Rs. 40.00
Part 1 Human beings
Part 2 Things around us
Part 3 Living and non-living things
Part 4 Animals
Part 5 Animals and their babies

2a — 969 0 10094 7, Rs. 40.00
Part 1 Human beings
Part 2 Health and safety
Part 3 Animals
Part 4 More about animals
Part 5 Sound
Part 6 Magnetism

Intro b — 969 … 10142 0, Rs. 35.00
Part 1 Plants
Part 2 Food
Part 3 Light and Heat
Part 4 Movement
Part 5 Distance
Part 6 Earth and Sky
Part 7 Time

1b — 969 0 10093 9, Rs. 40.00
Part 1 Objects
Part 2 Plants
Part 3 Force and machines
Part 4 Energy
Part 5 Sound
Part 6 Magnetism
Part 7 Heat and temperature
Part 8 Light and shadow
Part 9 Time

2b — 969 0 10095 5, Rs. 40.00
Part 1 Colours
Part 2 Plants
Part 3 Force and machines
Part 4 Energy
Part 5 Electricity
Part 6 Material and matter
Part 7 Time

3a — 969 … 10096 3, Rs. 40.00
Part 1 Human beings
Part 2 Healthcare and safety
Part 3 Animals
Part 4 Sound
Part 5 Magnetism
Part 6 More about animals

4a — 969 0 10098 X, Rs. 40.00
Part 1 Human beings
Part 2 Healthcare and safety
Part 3 Living things and their needs
Part 4 Living things protect themselves
Part 5 Sound
Part 6 Magnetism

5a — 969 0 10100 5, Rs. 50.00
Part 1 Human beings
Part 2 Healthcare and safety
Part 3 Animals
Part 4 Sound

3b
Light and colour
Plants
Heat energy
Light energy
Force and energy
Materials and matter
Earth and atmosphere
Time

4b — 969 0 10099 8, Rs. 40.00
Part 1 Colours
Part 2 Plants
Part 3 Heat and temperature
Part 4 Electricity
Part 5 Time

5b — 969 0 10101 3, Rs. 50.00
Part 1 Plants
Part 2 Animals
Part 3 Force and motion
Part 4 Heat and electricity
Part 5 Matter
Part 6 Earth and atmosphere
Part 7 Time

(Prices are subject to change without notice)

Also under publication: Available in 1994

Ferozsons Primary English
Ferozsons Primary Mathematics
Ferozsons Primary Atlas.

FEROZSONS (Pvt) LTD.

LAHORE RAWALPINDI KARACHI

Lahore: 60, Shahrah-e-Quaid-e-Azam, Phones: 301196-98 Fax: 627881
Rawalpindi: 277, Peshawar Road, Rawalpindi, Phone: 563503 Fax: 5642
Karachi: 1st Floor, Mehran Heights, Main Clifton Road, Karachi, Phones: 570527-570534-537730 Fax: 570534